U18447.   17-12-09.

Title - FALSAFA MEER YAANI SUKHAN MEER KE HAR SHOBA KALAAM PAR EK MABSOOT TABSIRA.

Author - Aah Seetapuri.

Publisher - General Publishing And Printing House (Seetapur).

Date - 1936

Pages - 164

Subjects - Meer Taqi Meer - Sawaneh-o-Tanqeed
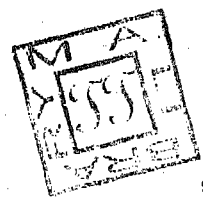
بیسویں صدی کا تنقیدی کارنامہ

فلسفۂ میر

یعنی

خدائے سخن میر علیہ الرحمہ کے ہر شعبۂ کلام پر ایک مبسوط تبصرہ

از

ڈاکٹر آہ سیتاپوری

کتبہ ذاکر حسین عابدی امروہوی

فہرست مضامین

انتساب

جس طرح ہوائیں پھولوں سے مس ہو کر عطر بیز ہوتی ہیں

جس طرح ذرے آفتاب سے کسب ضیا کر کے چمک اُٹھتے ہیں

اسی طرح اپنی اس تالیف کی منزلت بڑھانے کے لئے

میں اسکا انتساب، سرپرست ادب، قدرشناس ہنر سرکار مہاراجکمار

محمد امیر حیدر خان بہادر صاحب دام اقبالہ

آف محمود آباد کے نام نامی سے کرتا ہوں۔

آہ سیتاپوری

سرکار مہاراجکمار محمد امیر حیدر خان بہادر صاحب
دام اقبالہ

مقدمہ

(از پروفیسر علامہ اشہر لکھنوی۔ ایم۔ اے)

شاعر کے عالم خیال کی نمایاں تصویر کا نام شعر ہے جسکی دلکشی مسلم، جسکی عالمگیری ثابت، کبھی جذبات رنج و غم کا آئینہ دار، کبھی تفریح و سرور کا رنگین مکالمہ۔ لطف یہ کہ ایک شعر ایک مضمون کا حامل لیکن پڑھنے والوں کی مختلف طبائع کے مطابق لذت بخش، کبھی تاریخ کے زبردست افراد کے نام کیساتھ دنیا کے ورق پر رہجانے والا، کبھی مردہ قوموں میں احساس کی روح پھونکنے والا، کبھی کسی زمانے کی مکمل تاریخ، اور کبھی کسی معاشرت پارینہ کی مکمل تشریح۔

ان سب کے علاوہ شعر کا دلچسپ اور وسیع مصرف معاملات حسن و عشق کا اظہار ہے۔ جو شاعر اس اظہار میں جتنا زیادہ کامیاب ہوا اتنا ہی زمانے کی نظروں میں اوسکا وقار قائم ہوگیا۔

ادب اردو کا جہانتک تعلق ہے ایسے کامیاب شعرا کی فہرست میں حضرت میر تقی میر کے نام کو شرف تقدم حاصل ہے حتیٰ کہ کاملین فن نے اون کو اپنا پیشوا مانا اور اون کے اشعار کو اپنا نمونہ عمل بنایا۔ جب تک ادب اردو کا وجود صفحہ دنیا پر باقی ہے۔ اونکا نام ہر اردو داں کی زبان پر احترام کیساتھ جاری رہیگا۔ اور رہنا بھی چاہئے۔

گو میر صاحب کے زمانہ میں اردو نے ترقی کے ابتدائی مدارج بھی اچھی طرح طے نہیں کئے تھے۔ لیکن میر صاحب کا کلام یہ بتاتا ہے کہ اون کو زبان کے مدارج ارتقائی سے کوئی غرض نہ تھی۔ اون کا صحیح اندازہ، انتخاب اور مصرف الفاظ ہی فطرتاً اون کے قائد تھے۔ جن کے ماتحت اون کی فکر لطیف کارفرما ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ باستثنائے چند الفاظ جن کو آج ادبی دنیا نے متروک کردیا ہے۔ میر صاحب کی نظمی زبان فصاحت کے کانٹے میں تلی ہوئی ہے۔ جسے دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ گویا میر ہمارے ہی زمانہ کا شاعر ہے۔

یہ مشہور ہے کہ شعر وہی پر اثر ہوتا ہے جو شاعر کے مافی الضمیر جذبے کا صحیح ترجمان ہو۔ اگر یہ صحیح ہے تو میر صاحب کے اشعار کی جادو طرازی کا قوی سبب یہ بھی ہے کہ وہ ایک عالم کیف میں شعر کہتے تھے۔ اس سلسلہ میں مجھے بھی حضرت ناطق لکھنوی کا وہ مقولہ یاد آگیا جو اونھوں نے غالب و میر کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔ یعنی "میر عاشق شاعر تھا اور غالب کامل شاعر"۔

میر صاحب کی شاعری کے متعلق یہ کتاب جس کے سرورق پر مقدمہ نظر آرہا ہے حضرت

آہ سیتاپوری کی ان انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ موصوف صحرائے ادب کے ایک نوجوان سیاح ہیں۔ آپ کے علمی انہماک پر آپ کی تصنیفات ذیل شاہد ہیں۔

"آہ کے سو شعر"۔ "تجلی ہما"۔ "قومی زبان"۔ "گنج پنہاں"۔ "گناہ کی دلدل"۔ "انجام محبت"۔ "پریم کا اجالا"۔ "خواب پریشان"۔ وغیرہ وغیرہ

موصوف نے جو مواد اس ادبی انداز کو دلچسپ بنانے کے لئے پیش کیا ہے وہ ادبی ذوق رکھنے والوں کے لئے ایک قابل قدر چیز ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس تنقید کے بعض مقامات سے میں اتفاق نہ کر سکوں۔ لیکن پھر بھی میری نظر میں کلام میر پر اس سے زیادہ مبسوط اور دلچسپ تبصرہ اردو ادب میں اس وقت موجود نہیں۔

خدا کرے حضرت مولف اپنی محنت کی خاطر خواہ داد پائیں۔

(راشہر)

ڈاکٹر آہ سیتاپوری

معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

خدائے سخن میر علیہ الرحمہ کی بارگاہ میں اساتذۂ ماضی و حال کا خراج عقیدت

(سودا)

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

(مصحفی)

اے مصحفی تو اور کہاں شعر کا دعوے
پھبتا ہے یہ انداز سخن میر کے منھ پر

(ناسخ)

شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

(آتش)

آتش بقول حضرت سودا شفیق من!
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

(غالب)

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ولہ

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ!
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

(ذوق)

نہ ہوا اور نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بڑا زور غزل میں مارا

(عیش)

سچ تو یہ ہے شعرائے جہاں میں عیشؔ فقط　　کلام میر ہے البتہ دل پسند اپنا

(مجروح)

یوں تو ہیں مجروحؔ شاعر سب فصیح　　میر کی پر خوش بیانی اور ہے

(رند)

شیخ ناسخؔ خواجہ آتشؔ کے سوا بالفعل رندؔ　　شاعران ہند میں کہتے ہیں طرز میر ہم

ولہ

تیرا کلام کتنا مشابہ ہے میر سے　　عاشق ہیں رندؔ ہم تو اسی بول چال کے

(عرش)

لاکھ تقلید کیجئے اے عرشؔ　　پر کب انداز میر آتا ہے!

(داغ)

میر کا رنگ برتنا نہیں آساں اے داغؔ　　اپنے دیواں سے ملا دیکھئے دیوان ان کا

(جلال)

کہنے کو تو کہتے ہیں جلالؔ آپ بھی وہ طرز　　لیکن سخن میر تقی میر کی کیا بات

(امیر مینائی)

شاعری میں امیرؔ کی خاطر　　میر اپنی زبان چھوڑ گئے!!

(مولوی امداد امام اثر)

لیکن اثرؔ جو چشم حقیقت سے دیکھئے　　کوئی غزل سرا نہ ہوا میر کی طرح

(اکبر الہ آبادی)

میں ہوں کیا چیز جو اس طرز پہ جاؤں اکبرؔ
ناسخؔ و ذوقؔ بھی جب چل نہ سکے میر کے ساتھ

(مولنا صفی)

ابیات غزل میں حسن تاثیر وہی ہر نغمۂ دلکش میں بم و زیر وہی!

حافظ کا جو فارسی میں رتبہ ہے صفی!

اردو میں وہی مرتبہ میرؔ کا ہے

"فانی عالم کا ہر نقش رنگیں فانی ہے"۔ یہ ایک ایسا ناقابل انکار اصول ہے جو متواتر تجربات سے پوری طرح ثابت ہو چکا ہے۔ کلیوں کا کھلنا اور مرجھا جانا، سبزے کا خاک سے اگنا اور پھر خاک میں ملجانا۔ بہار کا ڈھلتی پھرتی چھاؤں کی طرح باغ مین آنا اور نکل جانا۔ یہہ تمام باتین صاف بتارہی ہین کہ ؎

اس موج خیز دہر مین تو ہے حباب سا
آنکھین کھلین تری تو یہ عالم ہے خواب سا
میر

پس اگر اس دار فنا میں بقا ہے تو صرف کمال کو۔ سمندر کی تہین ابھر کر پہاڑ بن جایئن اور پہاڑ کی چوٹیاں دب کر غرق آب ہو جایئن لیکن کمال ازل سے جس صورت میں ہے ابد تک اسی صورت میں باقی رہے گا۔

فنا کیا ہے؟ اس سوال کے جواب کیلئے اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ نقص کا ایک دوسرا نام ہے جو متضاد کمال شئے ہے جس چیز مین جتنا زیادہ نقص ہوگا وہ اوتنی ہی جلد فنا ہوگی۔ اور جو شئے جتنی کامل ہوگی اوسکی بقا اوتنی ہی زیادہ ہوگی۔

میر صاحب کی شاعری گو کمال تامہ نہیں لیکن پھر بھی نقص کا عنصر اس میں اتنا کم ہے کہ فنا کی دسترس سے صدیوں تک بچی رہے گی۔ کم از کم اردو لٹریچر کا جب تک نام بھی صفحۂ ہستی

پر باقی ہے میر صاحب کی شاعری اسی طرح زندہ رہے گی جیسی کہ وہ آج ہے۔ چنانچہ خود میر صاحب فرما گئے ہیں ؎

جانیکا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہیگا
میر

میر صاحب اگر کسی دوسری زبان میں پیدا ہوئے ہوتے تو آج سیکڑوں کتابیں ان کی شاعری پر شائع ہو چکی ہوتیں لیکن اردو والوں کی بے حسی قابل افسوس ہے کہ آجتک سوائے کلیات میر اور انتخابات میر کے اور کوئی کتاب میر کی شاعری پر شائع نہ ہو سکی۔

کلیات میر کو جس صورت میں شائع کیا گیا ہے خدا نہ کرے کہ کسی شاعر کا کلام اس طرح تباہ کیا جائے۔ ذرا غور کرنے کی بات ہے کہ میر کا کلام اور اتنا لغو بادامی کاغذ پھر اس پر بھی کفایت شعاری کو اس حد تک بنا ہا گیا ہے کہ جدول تک کی جگہ خالی نہیں چھوڑی گئی۔

اس کلیات سے انتخابات کے سلسلہ میں اکثر مقامات پر ایسا اتفاق ہوا ہے کہ طباعت کی بیہودگی کی وجہ سے بعض اعلیٰ اعلیٰ درجہ کے شعر تک مجھ سے نہ پڑھے جا سکے۔ لہذا مجبوراً ان کو نظر انداز کرنا پڑا۔ حالانکہ بعض مسلسل نظموں میں اس تعویق سے لطف میں بھی کمی ہو گئی ہے لیکن کیا ہی کیا جاتا۔

جن حضرات نے شعراء مغرب کے مجموعات کلام دیکھے ہیں وہ نہایت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ وہاں کے پبلشر اس معاملے میں کتنی فیاضی سے کام لیتے ہیں۔ کتابوں کی دیدہ زیب جلدیں، طباعت کی خوشنمائی اور کاغذ کی عمدگی ہی ان میں ایسی ہوتی ہے جن کو دیکھکر خواہ مخواہ یہ کتابیں پڑھنے کی خواہش دل میں پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس کے برخلاف میر صاحب کے دیوان کی یہ حالت ہے کہ اگر کوئی شخص انکی صحیح عظمت سے واقف نہ ہو اور اسے یہ دیوان پڑھنے کیلئے دیدیا جائے تو وہ اسے اٹھا کر

پھینک دیگا اور اپنی نظر کو ایک ایسے بدنما منظر سے الجھانا کبھی پسند نہ کریگا۔
مزید قابل افسوس بات یہ ہے کہ میر صاحب کی کئی تصنیفات ایسی ہیں جو اس وقت تک طبع نہ ہو سکیں۔ علی الخصوص ان کا فارسی دیوان جو بہترین شاعرانہ جواہرات سے مالامال ہے۔ بوسیدہ کاغذوں پر لکھا ہوا کیڑوں کے ہاتھوں اپنی عمر کے آخری لمحے گذار رہا ہے۔ آج ہمارے ملک میں سیکڑوں رئیس، نوابین، راجگان اور مہاراجگان موجود ہیں جن کا لاکھوں روپیہ روز گورنروں کی دعوت اور وائسرائے کے ڈنرمیں اڑ جاتا ہے۔ کیا ان میں سے کوئی ایسا نہیں کہ میر صاحب کی ان بیش بہا غیر مطبوعہ تصنیفات کو شایع کرا کے ان کی عمر میں ایک معقول اضافہ کردے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

خدا غریق رحمت کرے مرحوم عزیز رام پوری ایڈیٹر نیرنگ کو جنہوں نے اپنے رسالہ کا میر نمبر شایع کرکے کم از کم قوم کو یہ تو بتا دیا کہ میر صاحب کی تصنیفات صرف وہی نہیں جو ہمارے سامنے ہیں۔ بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو گمنامی کے پردے میں پڑی ہیں۔

یہ کتاب جسے میں اس وقت پیش کر رہا ہوں دراصل میں نے ۱۹۲۸ء میں لکھی تھی۔ چنانچہ اس سال جب میر نمبر شایع ہونے والا تھا تو اس کا اقتباس بھی میں نے ایڈیٹر صاحب نیرنگ کو بھیجا۔ لیکن بدقسمتی سے میرا مضمون غالباً اس وقت پہونچا جب میر نمبر کی کتابت ختم ہو چکی تھی۔ لہذا اوسکی اشاعت ملتوی رہی۔
کتاب ہذا چونکہ اس وقت تک میری لتساہلی سے ناتمام رہ گئی تھی لہذا اوسے شایع بھی نہ کرا سکا۔ اس سال کلام میر کا جو دورہ کیا تو مردہ جذبات میں پھر جان پڑ گئی۔ اور سچ پوچھئے تو انہیں کی وجہ سے میں اس وقت اس ناتمام کتاب کو تمام کرکے کسی قدر اضافات اور ترمیمات کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔

اس کتاب میں میں نے میر صاحب کے ہر شعبہ کلام پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلہ میں اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ جہاں تک ہو سکے غیر فرسودہ نکات ہی پیش کروں۔ مزید دلچسپی کیلئے ابتدا میں شاعری کی حقیقت، شاعری کی تاریخ اور اردو شاعری کے فلسفے پر بھی ایک اجمالی تبصرہ کر دیا ہے۔

اپنی تحریر میں مجھے کسی حد تک کامیابی یا ناکامی رہی۔ اس کا فیصلہ کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ فطرتاً ایک صناع اپنی صنعت کو بہترین سمجھتا ہے۔ لیکن محض اس کا خیال اس کی صنعت کو بہترین نہیں بنا سکتا۔ بہترین وہی ہے جسے بہترین لوگ بہترین سمجھیں۔

دبی زبان سے مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ غالباً یہ پہلا مسلسل تبصرہ ہے جو کلام میر پر نکل رہا ہے۔ لہذا اگر میں اپنی اس ادبی خدمت پر فخر کروں تو شاید اسے خود ستائی کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔

جن کاوشات کا اس تبصرے میں مجھے سامنا کرنا پڑا ہے ان کی فہرست کا اندراج رہنا نامناسب نہیں۔ لیکن میں فضول اپنا اور ناظرین کا وقت خراب کرنا نہیں چاہتا اہل نظر خود میری عرق ریزی کا اندازہ کر لیں گے۔

خیر! یہ خشک باتیں کہاں تک۔ بس اب آئیے میر کے میخانۂ شاعری کا دروازہ کھلتا ہے۔

قبل اس کے کہ میں میر صاحب کی شاعری سے بحث شروع کروں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عام شاعری پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔

شاعری کیا ہے؟

اس سوال کا کوئی ایسا جواب دینا جس پر اتفاق عام ہو جائے ایک مشکل امر ہے۔ بقول ڈاکٹر ٹیگور "شاعری کی حقیقت الفاظ کے ذریعہ کسی طرح بے نقاب نہیں کی جا سکتی"۔ اگر کوئی شخص پوچھے کہ خوشبو کسے کہتے ہیں؟ لذت کس چیز کا نام ہے؟ ذائقہ کیا شے ہے؟ تو اس کا بالکل ٹھیک جواب کسی طرح نہیں دیا جا سکتا ان سوالات کے حل کا صرف ایک ذریعہ ہے۔ اور وہ خود مسائل کی قوت احساس ہے جس سے مدد لیکر وہ خود کو مطمئن کر سکتا ہے۔

جس طرح ان ظنی سوالات کا جواب ناممکن ہے اوسی طرح شاعری بھی جو مجسم ظنیات ہے احاطہ بیان میں نہیں آسکتی۔ پس اصل شاعری کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ انسان کے جذباتی یا تخیلاتی اجسام کی نامحسوس، باریک رگوں کے ارتعاشات کا نتیجہ ہے۔ جس وقت ساز جذبات یا تخیلات کے تار کسی وجہ سے حرکت کرتے ہیں تو ان میں سے ایک نغمہ پیدا ہوتا ہے جسے ہم اپنی اصطلاح میں شاعری کہتے ہیں:-

زاویہ نظر کو کسیقدر اور تنگ کر کے فنی حیثیت سے شاعری کی تعریف ان الفاظ میں ہو سکتی ہے کہ واردات[1] قلبی یا دماغی کو لقبیہ موزونیت معنویت اور قافیہ الفاظ کا جامہ پہنانے کا نام شاعری ہے۔

بعض علمائے اشراقین نے اس خیال میں ارادہ مصنف کا بھی اضافہ کیا ہے یعنی انکی رائے میں وہی کلام موزوں مقفیٰ اور با معنی شعر ہو سکتا ہے جو بار ادہ مصنف کہا جائے لیکن مجھے اس خیال سے قطعاً اختلاف ہے۔ میرے نزدیک شعر میں ارادہ مصنف ایک بالکل غیر ضروری چیز ہے۔

مقصد شاعری دراصل موثر ترین طریقہ پر جذبات یا خیالات کا اظہار ہے۔ قید موزونیت اور قافیہ کی قید محض اس وجہ سے رکھی گئی کہ بغیر معنویت کے تاثر محال ہے اور موزونیت اور قافیہ سے اثر میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ لیکن ارادہ مصنف کیوں ضروری ہے۔ یہ گتھی میں کسی طرح نہ سلجھا سکا۔

بعض محققین ایک اور قید شاعری کیلئے لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شاعری وہی ہے جو ایسے جذبات کو برانگیختہ نہ کرے جن سے سوسائٹی کو نقصان پہونچنے کا احتمال ہو۔ میرے خیال میں یہ قید بھی بالکل مہمل ہے۔ ایک مصور اگر فرض کیجئے کہ ایسی تصویر بناتا ہے جس سے دیکھنے والوں میں بہ یک نظر کوئی مکروہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے تو کیا اس کی مصوری قابل داد نہ ہوگی۔ واقعہ تو یوں کہ قدر دان نگاہیں اس کی صناعی کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ یہی حالت شاعری کی بھی ہے۔ ہر وہ شعر جو سامع کے کسی جذبہ کو برانگیختہ کر سکتا ہے صرف شاعری ہی نہیں بلکہ شاعری کے اعلےٰ اقسام میں شمار ہونے کا حق رکھتا ہے۔

---

[1] بعض زبانوں میں موزونیت اور قافیہ کی قید بھی شاعری کیلئے ضروری نہیں۔

ملٹن نے پیراڈائز لاسٹ (Paradise Lost) میں جو ([illegible])
کے جدعویاں کی جو تشریحات پیش کی ہیں آجتک دنیا کے بہترین شاعرانہ کارنامہ
خیال کی جاتی ہیں۔
واقعہ یہ ہے کہ حقیقی شاعر اس قسم کی تمام قیود سے آزاد ہے۔ اس کا کام صرف
ہوا میں اڑتے ہوئے خیالات نازک کو صید کرکے الفاظ کی زنجیروں میں باندھنا ہے۔
وہ ایک ریفارمر کیطرح اس بات کا بالکل ذمہ دار نہیں کہ اس کا یہ فعل سوسائٹی کے
لئے مفید ہوگا یا مضر!
سوسائٹی کے فائدے کا خیال اگر موضوع شاعری قرار دے لیا جائے تو اس قید
کی وجہ سے اصل شاعری کو بہت کچھ نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ جبتک
جذبات آزاد نہ ہوں گے ان میں فراوانی اور تاثیر کسی طرح پیدا نہیں ہوسکتی
ڈاکٹر ٹیگور سے پوچھا گیا کہ آپ نے فلاں ناول کس مقصد سے لکھا ہے:۔
موصوف نے فرمایا کہ جس وقت چڑیاں چہچہاتی ہیں تو ان کا کیا مقصد ہوتا ہے؟
میں نے یہ کتاب صرف اس لئے لکھی ہے کہ مجھے اس کے لکھنے میں مزا آتا تھا۔
یاد رکھنا چاہیئے کہ حقیقی شاعری وہی ہے موضوعات و مقاصد خود جس کے
پابند ہوں۔ مقاصد کی پابند شاعری فی الحقیقت شاعری کہلانے کی مستحق نہیں ہے
یہاں پر ایک اعتراض پیدا ہوسکتا ہے کہ دنیائے ادب میں مختلف موضوعات کے
تحت میں آج عمدہ سے عمدہ ہزاروں نظمیں موجود ہیں جو انہیں موضوعات کو مقصد
قرار دیکر کہی گئی ہیں۔ کیا یہ نظمیں شاعری کہلانے کی مستحق نہیں ہیں؟
اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو ہر ذی فہم آدمی کا دماغ خود اس اعتراض کا
جواب دیسکتا ہے۔ جتنی اعلیٰ درجہ کی نظمیں ہم مختلف سرخیوں کے تحت میں دیکھتے ہیں
ان میں شاذ ہی ایسی ہوں گی جن کا موضوع [illegible] شاعر کے [illegible] نظر رہا ہو۔

ایک مقصد یا موضوع جو کسی نظم سے وابستہ ہے درحقیقت اس نظم کے عالم وجود میں آنے کے بعد پیدا ہوتا ہے جسے شاعر اپنی نظم کی سرخی قرار دے لیتا ہے۔ یا کم از کم ہمیں اتنا تو ضرور ماننا پڑیگا کہ یہ موضوعات اگر اس نظم سے موخر نہیں تو اثر نظم سے ضرور موخر ہیں۔

ایک شاعر کو شعر کی تکمیل تک معمولی طور پر تین درجے طے کرنا ہوتے ہیں۔ پہلا درجہ تو وہ ہے جب شاعر کسی منظر سانحہ یا کوائف سے اثر لیتا ہے اور اس کے خیالات یا جذبات میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا درجہ وہ ہے جب وہ اپنے خیالات یا جذبات کی ایک ذہنی تصویر تیار کرتا ہے۔ تیسرا درجہ وہ ہے جب وہ اسے باقاعدہ منظوم صورت میں پیش کرتا ہے۔

ایک اچھی نظم کا موضوع بس زیادہ سے زیادہ دوسرے درجہ کے بعد شاعر کے سامنے آتا ہے جن نظموں کا موضوع قبل نظم ہی شاعر کے پیش نظر ہوتا ہے ان میں اگر غور سے دیکھا جائے تو بالعموم خشکی، آورد اور دماغی اثرات کا غلبہ نظر آئے گا۔

کسی ضرورت یا مقصد کی پابند نظمیں میری رائے میں اعلیٰ قسم کی شاعری میں شمار ہونے کی مستحق نہیں۔ حقیقی شاعری صرف آزاد تخیل اور آزاد جذبات کو خوش [illegible] کہہ سکتی ہے۔

اسی باریک نکتہ کو پیش نظر رکھ کر اہل فن نے شاعری کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔

۱۔ داخلی شاعری

۲۔ خارجی شاعری

داخلی شاعری کا مفہوم وہ وجدانی شاعری ہے جو موضوعات کی پابند نہیں۔ اس قسم کی شاعری سے سامع ہمیشہ حظ روحانی حاصل کرتا ہے۔

خارجی شاعری مقاصد کی پابند داخلی شاعری کو کہتے ہیں۔ اس قسم کی بیشتر شاعری غزلئے داخلی ہوا کرتی ہے۔

اعلےٰ شاعری ابھی تک تو عام شاعری سے بحث ہوئی لیکن اب میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اعلیٰ شاعری کسے کہتے ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ اعلیٰ شاعری کا کوئی معیار نہیں۔ جو شعر جسے پسند آجائے وہی اچھا ہے لیکن میں اس اصول سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اگر ایک شعر خواہ مخواہ کسی کو پسند ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ اسی خاص شخص کیلئے اچھا ہو سکتا ہے لیکن اس پسندیدگی کو تعمیم کسی طرح نہیں دی جا سکتی۔ میرے نزدیک اعلیٰ قسم کی شاعری میں حسب ذیل باتیں ہونا ضروری ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ شعر میں کیف یا رس ہونا چاہئے جیسے ایک سنسکرت کے محقق ممٹ جی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

वाक्यम रसात्मकम काव्यम

"شاعری وہ ہے جسمیں کیف (یا رس) ہو"

دوسرے یہ کہ شعر میں جس کیفیت کی ترجمانی کیجائے وہ کیفیت سامع پر طاری ہو جائے۔

مثلاً ایک شعر میں کسی آدمی کے اس خوف کا ذکر کیا گیا ہے جو جنگل میں ایک خونخوار درندے کے مشاہدے سے اس پر طاری ہوا تھا۔ اگر یہ شعر اس خوف کو سامع کے دل پر طاری کر سکتا ہے تو اسے مکمل شعر سمجھنا چاہئے۔

تیسرے شعر جس زبان میں کہا گیا ہو اس کے اعتبار سے ایسا مکمل ہو کہ اس میں کسی لفظ کے تغیر کو گنجائش نہ رہے۔ کیونکہ یہ ایک مسلم بات ہے کہ کسی حقیقت کے

اظہار کیلئے صرف ایک فاعل، ایک فعل، ایک صفت، ایک معروف اور ایک ضمیر وغیرہ
ہو سکتا ہے۔ اگر شعر میں کسی قسم کے تعبیر کی گنجائش باقی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا
کہ شاعر اپنے بیان سے اصل حقیقت کو ظاہر نہ کر سکا۔
بعض آئمہ فن کے خیال میں مندرجہ بالا باتوں کے ساتھ، اچھے شعر میں دو باتیں اور

ضروری ہیں۔ اول یہ کہ شعر میں موثر کنایات کے ذریعہ مفہوم ادا کرتے ہوئے ایک شے کو
اس صورت میں پیش کیا گیا ہو کہ عام نگاہیں اوسے ویسا نہ دیکھ سکتی ہوں، مثلاً

اوس مژہ پر چشم زدہ نے بار ہا
عاشقوں میں برچھیاں چلوائیاں — میر

محبوب کی مژہ کی برہمی سے عام نگاہیں برچھیاں چلتے نہیں دیکھ سکتیں لیکن ایک شاعر جسکی
نظر عام نگاہوں سے مختلف اور عمیق ہے یہ تماشے بآسانی دیکھ لیتا اور دوسروں کو مطلع کر سکتا ہے۔
یا پھر شعر محاکات و سادگی کی بہترین نمونہ ہو یعنی شاعر نے جس بات
کا ذکر کیا ہے اسے بلا کم و کاست سادے سادے الفاظ میں اس طرح ظاہر کر دیا ہو
کہ سننے والے کے سامنے اصل شے کی تصویر آجائے۔ جیسے ؎

یہ بزم سلیماں خوش ترکیبوں کا میرے نہ اسے چمن سے گیا
سوتے سے اٹھ کر جو آنکھیں ملتیں لیے انگڑائی جا بجا ہیں

دوسرے یہ کہ شاعر نے جس بات کو کہا ہو اثر لیکر کہا ہو، تاکہ شعر سراپا تاثیر بن جائے
کیونکہ یہ ایک مسلم بات ہے کہ

"از دل خیزد بر دل ریزد"

بہرحال انہیں حدود کے اندر ایک اچھے شعر کو جانچا جا سکتا ہے۔ اور جو شعر
ان اصولوں کی کسوٹی پہ پورا اترے اوسے اعلیٰ شاعری سمجھنا چاہیئے۔ اب رہا

یہ سوال کہ اعلیٰ قسم کے اشعار میں درجے کس طرح قائم کئے جا سکتے ہیں۔ اس کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔

دنیا کے کسی لٹریچر میں اس وقت کوئی شعر ایسا نہیں جسے متفقہ طور پر بہترین مان لیا جائے۔ ایک آدمی کسی شعر کو پسند کرتا ہے۔ دوسرا دوسرے شعر کو ترجیح دیتا ہے۔ تیسرا تیسرے شعر کا دلدادہ ہے۔ بلکہ ایک آدمی ہی ہر وقت ایک ہی شعر کو پسند نہیں کرتا۔

انسان فطرتاً متلون مزاج ہے۔ وقوعات عالم کے خارجی اثرات تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس کے خیالات میں تغیر پیدا کرتے رہتے ہیں۔ آدمی جس وقت جس عالم اور جس خیال میں ہوتا ہے اگر اسی نوع کا کوئی شعر اسکے سامنے آجاتا ہے تو اس پر غیر معمولی اثر کرتا ہے اور وہ اسے بہترین شعر سمجھنے لگتا ہے۔ بہرحال تغیر خیالات کیوجہ سے یہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں شعر آدمی پر زیادہ اثر کرے گا۔ اور فلاں کم! بس اعلیٰ قسم کے اشعار میں درجے قائم کرنے کیلئے اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ مندرجہ بالا اصولوں پر جو شعر جتنا زیادہ پورا اترے اوسے اتنا ہی بہتر سمجھنا چاہیئے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ شاعری کے تاریخی پہلو پر بھی کچھ روشنی ڈال کر یہ دکھاؤں کہ شاعری کی ابتداء کب سے اور کیونکر ہوئی۔

شاعری کی ابتداء

شاعری کی ابتداء کب سے ہوئی؟ اس کا ٹھیک حل ہمارے پاس اسوقت موجود نہیں۔ ہماری ادبی تاریخیں شاعری کا آغاز جس صورت میں بتاتی ہیں اُسے موجودہ تحقیقات کے دور میں کسی طرح باور نہیں کر سکتے۔

یہ ایک مسلم بات ہے کہ قدیم مورخ (خواہ وہ کسی گروہ کے ہوں) معقولیت
کو بالائے طاق رکھکر اعتقادیات کا اظہار اتنے تیقن کے ساتھ کرتے تھے کہ اصل حقیقت
منہ دیکھکر رہ جاتی تھی۔ ہماری قدیم تاریخ ادب بھی انہیں حضرات کی کاوشات
دماغی کا نتیجہ ہے۔ لہذا اس سے صحیح واقعات کا پتہ چلانا کوئی آسان کام نہیں۔
دوسرے یہ کہ شاعری ایک وجدانی شئے ہے اور جذبہ انسان میں فطرتاً
موجود ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ اس جذبہ فطری نے
شاعری کی صورت کب اختیار کی۔

سیمٹک تاریخوں سے صرف اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے سب سے پہلے
شاعر حضرت آدم تھے جنہوں نے اپنے بیٹے ہابیل کے قتل ہو جانے پر اس کا
مرثیہ زبان سریانی میں کیا تھا۔ محض اعتقاد کی وجہ سے علامہ زمخشری اور
علامہ فخر رازی نے اس خیال سے اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آدم نبی تھے
لہذا ایک معصوم ہونے کی حیثیت سے ان کے ضمیر پر جذبہ شعری کسی طرح طاری نہیں
ہو سکتا تھا۔ آدم نے اپنے بیٹے کا مرثیہ نثر میں کہا تھا جس کا ترجمہ عربی میں
نظم میں کیا گیا۔

بہرحال زیادہ تر مصنفین کا یہی خیال ہے کہ وہ مرثیہ حضرت آدم نے نظم میں
کہا تھا (چنانچہ صائب کہتے ہیں ؎

آنکہ اول شعر گفت آدم صفی اللہ بود
طبع موزوں حجت فرزندی آدم بود

لیکن نہ تو اب آدم کا وہ مرثیہ موجود ہے نہ مورخین نے اس مسئلہ پر کوئی
مسکت استدلال کیا ہے۔ لہذا اس بات کو تسلیم کرنا شان تحقیق کے خلاف ہے۔
دنیا کے لٹریچر کی سیر کرنے سے سب سے پرانی نظم جو ہمیں اسوقت ملتی ہے

وہ رگوید ہے جس میں چاند سورج اور دیگر مناظر قدرت سے متعلق جا بجا کچھ نظمیں منتروں کی صورت میں پائی جاتی ہیں۔

ان نظموں کی صورت قیاسات صرف اسیقدر بتاتے ہیں کہ قدیم ترین دور کے رشی اور لوگ جنگ و جدل سے فراغت پاکر جب کبھی اطمینان سے بیٹھے ہوں گے تو خاموش راتوں میں ستاروں کی تابندگی۔ لہلہاتے ہوئے سبزہ زار اور آفتاب و ماہتاب کی چھوٹ۔ خوشبودار پھولوں کی خوشبو میں بسی ہوئی ہوا کے جھونکے۔ پرسکون فضاؤں میں آبشاروں کے نغمے۔ دلکش گھاٹیوں میں چشموں کی روانی دیکھکر یقیناً ان کے جذبات شاعرانہ میں حرکت پیدا ہوتی ہوگی اور وہ گنگنا کر اس قسم کے منظوم منتر تصنیف کیا کرتے ہوں گے جو اپنی دلکشی کی وجہ سے اوس زمانہ میں عام انسانی کلام کی سطح سے بلند سمجھے جاتے ہوں گے۔ چنانچہ اسی احترام کے جذبے نے آہستہ آہستہ انہیں کلام خدا بنادیا۔

بعض ہندو حضرات غالباً اپنے کسی مذہبی عقیدے کی وجہ سے رگوید کے منظوم منتروں کو ہی شاعری نہیں جانتے۔ میرے خیال میں یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ رگوید کے تمام منظوم منتر انہی چھندوں کی پابندی سے کہے گئے ہیں جو آجتک ہندی شاعری میں رائج ہیں۔ مثلاً انسٹپ چھند۔ ([illegible]) گائتری چھند۔ ([illegible]) کرتی چھند [illegible] وغیرہ۔ اسکے علاوہ اس میں شاعرانہ خیالات بھی بافراط موجود ہیں۔ علی الخصوص وہ نظمیں جو صبح سے متعلق کہی گئی ہیں بے مثل ہیں۔

نمونتاً دو ایک ملاحظہ ہوں

ترجمہ

"۱۔ جس وقت (اہون کی) آگ روشن ہوتی ہے اور سورج نکلنے والا ہوتا ہے طلوع سحر کی روشنی دور تک جاتی ہے۔ سوتا دیوتا نے اسے اس لئے بھیجا ہے کہ اسکی روشنی میں ہم کاموں میں مصروف ہو جائیں اور تمام چوپائے اور دوپائے اپنی تساہلی دور کر دیں۔

۲۔ احکامات فطرت کی مخالفت نہ کرتے ہوئے اور مخلوق کی مدد کرتے ہوئے گذشتہ صبحوں کی آخری صبح اور آنے والی صبحوں کی پہلی صبح تیزی سے چمک رہی ہے۔

۳۔ مثل ایک حسین معشوق کے سینہ کے وہ (صبح) قریب ہوتی جاتی ہے۔ اور مثل ایک مطرب کے وہ خوشگوار رموز کا انکشاف کرتی جاتی ہے۔

وہ مثل لکھی کے (اپنی بھنبھناہٹ سے) سوتے ہوؤں کو جگاتی آتی ہے۔ اور آن کو اون سہیلیوں کی آمد کی خبر دیتی ہے جو سچی اور وفادار ہیں۔"

یہ خیالات اصول نظم کی پابندی کے ساتھ نظم ہو جانے کے بعد بھی ادن کو شاعری نہ کہنا بہت بڑا ظلم ہے۔ اگر بفرض رگوید میں معمولی درجے ہی کی شاعری ہوتی تو بھی یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاعری کا نقش اول اور کیا ہو سکتا ہے ہمیں انکو شاعری تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہیئے تھا نہ کہ ان محاسن کے باوجود بھی ہم ان کی شاعرانہ عظمت سے انکار کیئے دیتے ہیں۔

میں یہ مان سکتا ہوں کہ رگوید کی نظمیں بحیثیت مجموع اس پائے کی نہیں جیسی رامائن یا کالیداس کے شاعرانہ کارنامے ہیں۔ لیکن

الفخر للمبتدی والفضل للمقتدی

کے اصول کے لحاظ سے شاعری کے اس قدیم ترین ڈھانچے کا احترام بھی ضروری ہے۔

اُردو شاعری کی ابتداء

اردو شاعری کے بابا آدم ہونے کا فخر بالعموم وَلی دکنی کو دیا جاتا ہے لیکن دورِ حال کی تحقیقاتوں نے اس خیال کو بہت کچھ مشکوک بنا دیا ہے۔

اگر سچ پوچھیے تو اردو کے سب سے پہلے شاعر امیر خسرو ہوئے ہیں۔ جو کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے ہم عہد تھے۔ ان کے اکثر اشعار ہندی اور فارسی کی آمیزش کے ساتھ ملتے ہیں۔ جیسے سے

زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے دل نہ لیہو کا ہے لگائے چھتیاں
خسرو

لیکن اردو والے ان کے اشعار کو اردو تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اردو کا پہلا ڈھانچہ قدرتاً ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

فارسی عروض و قافیہ کی پابندی کے ساتھ ابھی تک باقاعدہ طور پر سب سے پہلے اردو شاعر کا جو دیوان دستیاب ہوا ہے وہ محمد قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ کا ہے یہ دیوان فارسی ڈھنگ پر ردیف وار مرتب ہے اور شاید ابتک سرسالار جنگ بہادر رئیس اعظم ریاست حیدرآباد کے کتب خانہ عامرہ میں موجود ہے۔

اس دیوان کے متعلق HISTORY-OF-URDU.LITERATURE. ہسٹری آف اردو لٹریچر کے مصنف نے لکھا ہے۔

۲۔ اس کی نظموں کی خصوصیت شیرینی اور سادگی ہے۔ اس کے اشعار میں صوفیانہ اور عاشقانہ خیالات نمایاں طور پر ہیں۔ اس نے اپنے لئے وسیع میدان پیدا کیا ہے اور انسانی سوسائٹی اور حسنِ فطرت پر BEAUTIES-OF-NATURE

لہ ۱۵۸۰ء سے ۱۶۱۱ء) سہ اصل انگریزی عبارت کا بالاجمال ترجمہ درج کیا گیا ہے۔

بہت کچھ کہا ہے۔ ایک مثنوی ہندوستان کی ترکاریوں اور ایک چڑیوں کے کھیل پر ہے
(جس کا ہندوستان مین رواج ہے) بہت سی نظمین ان رسم ورواج پر بھی ہینا
جو یہان شادی، زچہ خانے اور مختلف تیوہاروں مین ہندو اور مسلمان برتتے ہیںا
جیسے ہولی۔ دیوالی۔ عید وغیرہ۔ اوسکی ایک نظم مین ایک مکالمہ پیالہ شراب اور
شیخ کے درمیان ہے۔ جو نہایت دلچسپ ہے۔ اوس نے متعدد قصیدے اور واقعہ
کربلا سے متعلق مرثیے بھی کہے ہیں۔

بہرحال اس سے یہ صاف ظاہر ہو سکتا ہے کہ آج جو چیز جدید اردو شاعری میں اجاگر
کرنے کی کوشش کیجا رہی ہے اس کی جھلک قطب شاہ کے دیوان میں موجود ہے۔

چونکہ قطب شاہ کی اردو بجائے برج بھاشا سے مخلوط ہونے کے تلگو
اور دوسری دکھنی زبانوں سے مخلوط ہے۔ لہذا اردو والے اولیت کا سہرا اب بھی
ولی کے سر باندھتے ہین۔ کیونکہ جو اردو کلام ولی مین ملتی ہے وہ وہی ہے جو برج بھاشا
کے اخلاط کے ساتھ دہلی اور آگرہ مین بولی جاتی تھی۔

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ صرف دہلی یا آگرے کی زبان
نظم کرنے سے ولی کو اولیت کا شرف کسی طرح حاصل نہین ہو سکتا۔ اردو کا مولد دراصل
دکھن ہے۔ جیسا کہ میر صاحب کہتے ہیں۔ ؎

خوگر نہیں کچھ یون ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا!

لہذا قدیم دکھنی اردو شعرا کے کلام مین دکھنی زبانوں کے نقوش ملنا ایک قدرتی بات ہے
جس کی وجہ سے انہین اردو شعرا کی فہرست سے نکالا نہین جا سکتا۔

اردو دکھن میں پیدا ہوئی اور سب سے پہلے شاہان گولکنڈہ کے سایۂ عاطفت مین
پرورش پائی۔ اس کے بعد اورنگ زیب کے ہاتھوں جب یہ سلطنتین تباہ ہوگئین تو اسے

یتیم ہوکر دہلی آنا پڑا لیکن بدقسمتی سے تھوڑے ہی عرصہ میں دہلی پر بھی زوال آگیا جس کے بعد اس نے لکھنؤ کا رخ کیا۔

ولی کی شاعری میں دہلی اور آگرہ کی زبان ہونے کا خاص سبب یہ ہو کہ اوس کی شاعری کی نشو و نما دہلی میں ہوئی ہے۔

اُردو شاعری

اس اجمالی بحث کے بعد اب میں ایک نظر اردو شاعری پر بھی ڈالنا چاہتا ہوں۔ زبان کی حیثیت سے اردو شاعری کا مخرج برج بھاشا ہے لیکن اُردو شاعری فارسی شاعری کے سانچے میں ڈھالی گئی ہے۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ اُردو شاعری نے آنکھ کھولکر وہ زمانہ دیکھا جب ہندوستان فارسی شعراء کی جولانگاہ بنا ہوا تھا ایران سے باکمال شعرا آتے تھے اور شیرازی نغمے سنا کر خاطرخواہ انعام پاتے تھے۔ ایسی صورت میں اس نوزائیدہ بچے کو قدرتاً اوسی طرز پر مائل ہونا چاہیئے تھا چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جس وقت اُردو شاعری منضبط ہوئی تو وہی طرز اختیار کیا جو فارسی شعراء کا ہونا چاہیئے تھا۔

اردو شعراء نے بھی شعرائے فارسی کی طرح حسن و عشق، گل و بلبل، مینوشی، اسیری صحرا نوردی، اور اسی طرح کے دیگر موضوعات پر طبع آزمائی شروع کی۔ اسکے علاوہ عروض و قافیہ بھی وہی رہا جو فارسی کا تھا۔ لیکن چونکہ اس کی ابتدا ہندوستان میں ہوئی تھی لہذا ہندوستان کے موسم، ہندوستان کے طائر اور ہندوستان کے مناظر قدرت بھی اس کے حصہ دار بن گئے۔

سوانح حیات سے سبق حاصل کریں۔ میرے خیال میں علاوہ شاعری کے انکی لائف ہی اس قابل ہے کہ زرین حروف میں لکھی جائے۔

میر صاحب پر ابتدا ہی سے فوج مصائب کی چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ ابھی وہ کمسن ہی تھے کہ ماں اور باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا یعنی اتنے بڑے تھے کہ کسی کا احسان لینا باعث ننگ سمجھتے تھے۔ مجبوراً اپنے سوتیلے ماموں خان آرزو کے ساتھ تلاش معاش میں دلی جانا پڑا۔ دلی میں خان آرزو کی زیر سرپرستی میر صاحب کی شاعری کو بہت کچھ عروج ہوا لیکن نازک مزاجی کی وجہ سے کوئی خاص مالی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اختلاف مذہب کی وجہ سے خان آرزو سے بھی نہ بنی۔ اور تمام متعلقین کو لیکر کسی دوسرے کرایہ کے مکان میں اٹھ آئے۔

اب میر صاحب کی مصیبتوں میں ناقابل برداشت اضافہ ہو گیا۔ دلی کی حالت بھی خراب ہو چلی تھی۔ مجبوراً لکھنؤ کا قصد کیا۔ سفر میں سب سے پہلے خرچ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہاں پوری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا۔ آخر ایک صاحب سے شرکت کر کے ایک گاڑی کرایہ پر کی اور دلی کو خیرباد کہا۔ راستہ میں ان ہم سفر صاحب سے بھی کئی مرتبہ تکرار ہوئی۔ غرض بہزار خرابی لکھنؤ پہونچے اور عام مسافروں کی طرح سرائے میں قیام کیا۔

اسی اثنا میں معلوم ہوا کہ کہیں قریب ہی مشاعرہ ہے۔ فوراً غزل کہی اور مشاعرہ میں جاکر شریک ہوئے۔ ان کی پرانی وضع [1] (کھڑکی دار پگڑی پچاس گز کے گھیر کا جامہ ایک پورا تھان پستولیے کا کمر سے لپٹا ہوا اس میں پٹری دار تہہ کیا ہوا ایک رومال لگا ہوا مشروع کا عرضدار پائجامہ، ناگ پھنی کی انی دار جوتی جسکی نوک ڈیڑھ بالشت اونچی۔ کمر میں ایک طرف سیف دوسری طرف کٹاری، ہاتھ میں جریب) دیکھکر

---

[1] ماخوذ از آب حیات۔

لکھنؤ کے بانکے ترچھے نوجوانوں نے قہقہے لگانا شروع کئے۔ میر صاحب بیچارے ایکطرف
سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ لالہ گردش کرتا ہوا ان کے سامنے بھی آیا۔ لوگوں نے بطور تمسخر کہ وطن
پوچھا۔ میر صاحب نے فوراً یہ قطعہ نظم کرکے پڑھا ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جسکو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا۔ ہر شخص نے معذرت کی۔ شہر میں ایک دھوم ہوگئی کہ میر صاحب
تشریف لائے ہیں۔

خلد آشیاں نواب آصف الدولہ بہادر کو اطلاع ہوئی۔ ازراہ قدردانی (۲۰۰)
روپیہ ماہوار مقرر کر دیا۔

کسی ہندی شاعر کا مقولہ ہے کہ ایک کامل اور بادشاہ میں فرق یہ ہے کہ بادشاہ پہاڑ پر
کھڑا ہے اور کامل زمین پر۔ جب بادشاہ کامل کو دیکھتا ہے تو یہ اوسے چھوٹا معلوم
ہوتا ہے اور جب کامل بادشاہ کو دیکھتا ہے تو وہ اوسے چھوٹا نظر آتا ہے یعنی نہ بادشاہ
اپنی دولت کے زعم میں کامل کو نظر میں لاتا ہے۔ نہ کامل اپنے کمال کے نشہ میں بادشاہ کو
کچھ سمجھتا ہے۔ اس کلیہ کا دوسرا رخ جتنا میر صاحب پر صادق آتا ہے۔ شاید
اس کی مثال مشکل سے مل سکے گی۔

ایک دفعہ نواب صاحب نے میر صاحب سے کسی غزل کی فرمایش کی۔ دوسرے دن جب
میر صاحب دربار میں گئے تو نواب صاحب نے پوچھا کہئے ہماری غزل لائے؟ میر صاحب
نے ابرو پر بل ڈال کر جواب دیا کہ حضور مضامین میری جیب میں تو رکھے نہیں ہیں
کہ آپ کی فرمائش فوراً پوری کر دوں۔ نواب صاحب نے ہنس کر ٹال دیا۔ اور فرمایا کہ
اچھا جب طبیعت حاضر ہو کہہ دیجئے گا۔

اسی طرح ایک دن نواب صاحب نے میر صاحب کو بلوایا اور کچھ شعر پڑھنے کی فرمائش کی میر صاحب نے ایک غزل کے کچھ شعر پڑھے۔ مگر نواب صاحب نے خاطر خواہ توجہ سے نہ سنا۔ میر صاحب بھلا اتنی فروبر دست تو ہیں کب برداشت کر سکتے تھے۔ فوراً بگڑ کر چلے آئے اور اسی روز سے ملازمت ترک کر کے دربار کا آنا جانا چھوڑ دیا۔ اسکے بعد نواب صاحب نے میر صاحب کے منانے کی بڑی کوشش کی، مگر اللہ رے وضعداری کہ میر صاحب کی روش میں کوئی فرق نہ آیا۔

ایک دن میر صاحب بازار سے جا رہے تھے کہ سامنے سے نواب صاحب کی سواری آگئی۔ نواب صاحب نے سواری روک لی اور نہایت محبت سے پوچھا کہ جناب قبلہ آخر آپ خفا کیوں ہو گئے ہیں؟ میر صاحب نے بگڑ کر جواب دیا کہ شرفا بازار میں باتیں نہیں کرتے۔ اور منہ پھیرے ہوئے چلے گئے۔ نواب صاحب بیچارے سر جھکا کر رہ گئے۔

ان نازک مزاجیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام عیش و آرام رخصت ہو گیا۔ افلاس نے پھر آ دبایا۔ پھر وہی فاقہ مستیاں شروع ہو گئیں۔ لیکن اس حالت میں بھی میر صاحب خود کو بادشاہ وقت سے کم نہ سمجھتے تھے۔ کمال کا گھمنڈ اتنا تھا کہ معمولی شعرا کا کیا ذکر نظیری اور حافظ کا شعر بھی اگر سامنے پڑھا جاتا تھا تو تعریف کرنا تو درکنار سر بھی مشکل سے ہلتا تھا۔

ایک دن میر صاحب سے کسی نے پوچھا کہ ریختہ میں آج کل کتنے شاعر ہیں؟ فرمایا صرف پونے تین۔ اوس نے کہا کون کون؟ کہا "ایک تو میں، دوسرے سودا، تیسرے آدھے شاعر درد۔ چوتھے چوتھائی شاعر سوز۔ اسطرح کل پونے تین شاعر ہوتے ہیں"۔

میر صاحب کا کیرکٹر | میر صاحب نہایت متقی اور پرہیزگار آدمی تھے۔

صبر وقناعت آپ کا خاصہ طبیعت تھا بعض تذکرہ نویسوں نے آپ کے متعلق بد مزاج اور بد دماغ کے الفاظ استعمال کئے ہیں لیکن میں یہ درشت الفاظ کسی طرح تحریر نہیں کرسکتا۔ بس زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ بیحد نازک مزاج تھے۔ اور یہی شان تہذیب ہے۔

میر صاحب کو سلف رسپکٹ کا ہمیشہ بڑا خیال رہتا تھا کسی صاحب دولت کی تعظیم کرنا آپ سخت توہین سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیشہ شکار آلام رہے۔ طبیعت میں انتہائے کمال کی وجہ سے استغنا حد سے زیادہ تھا۔

خلد آشیان نواب آصف الدولہ بہادر کے انتقال کے بعد جنت مکان نواب سعادت علیخان تخت نشین ہوئے۔ ایک دن نواب صاحب موصوف کی سواری جا رہی تھی۔ میر صاحب تحسین کی مسجد پر بیٹھے ہوئے وضو کر رہے تھے۔ سواری جب مسجد کے برابر پہنچی تو تمام لوگ تعظیم کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن میر صاحب نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ کون جا رہا ہے۔ انشا ہمراہ رکاب عالی موجود تھے۔ نواب صاحب نے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے جس کی تمکنت نے اسے اٹھنے بھی نہ دیا۔ انشا نے عرض کیا کہ حضور یہ وہی گدائے متکبر ہے جس کا ذکر اکثر حضور میں ہوا کرتا ہے۔ آج بھی فاقہ سے ہوگا مگر مگر مزاج کا یہ عالم ہے۔

نواب صاحب نے خلعت سرفرازی اور ایک ہزار روپیہ دعوت کا بھیجا۔ گو میر صاحب دو دن سے مسلسل فاقے کر رہے تھے مگر پھر بھی اس نذر کو قبول نہ کیا اور یہ کہکر واپس کر دیا کہ یہ کسی خانقاہ یا مسجد میں بھجوا دیجئے۔ میں کوئی محتاج یا فقیر نہیں ہوں۔

کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد نواب صاحب نے یہ خلعت انشا کے ہاتھ پھر بھیجا۔ جسے انشا کی لفاظیوں سے مجبور ہو کر میر صاحب کو لینا پڑا۔ لیکن پھر بھی غور کیجئے کہ جو کچھ میر صاحب نے کیا کسی معمولی دل و دماغ کا کام نہ تھا۔ واقعی میر صاحب کی ربائی

بالکل ان کے حسب حال ہے ؎

رنجش کی کوئی اوس سے روایت نہ سنی　　جز صبر کسی وقت حکایت نہ سنی
تہا میر عجب فقیر صابر شاکر　　ہم نے تو کبھی اوس سے شکایت نہ سنی

عہد میر کی زبان

کسی شاعر کے کلام کے مطالعہ سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ اس کے عہد کی زبان سے واقفیت حاصل کر لی جائے۔ اسی ضرورت کو پیش نظر رکھکر عہد میر کی زبان کا اجمالی ذکر کیا جاتا ہے۔

ہر زبان کے دور اور زمانے ہوا کرتے ہیں۔ اس وقت دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جو تغیرات کی زد سے محفوظ رہی ہو۔ چنانچہ اردو کی بھی یہی حالت ہے۔ آج سے ڈیڑھ سو سال قبل عہد میر کی جو زبان تھی اوس کا ایک اجمالی نقشہ دور حال کی زبان کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جس سے دونوں کا فرق محسوس ہو جائے گا۔

عہد میر	دور حال	عہد میر	دور حال	عہد میر	دور حال
کیدھر	کدھر	ہوا اس جہان سیاہ	ہوا یہ جہاں سیاہ	انہوں کے	ان کے
کیونکر	کیسے	ہم پاس	ہمارے پاس	ڈھائے کر	ڈھا کر
لاگا	لگا	کنے	پاس	جنہوں کا	جن کا
تد	تب	کہو ہو	کہتے ہو	بچھڑے	بچھڑ
جاگہ	جگہ	ہو ہو	ہو	دل ساتھ	دل کے ساتھ
تنک	ذرا	ایکوں	اکثر	مسیت	مسجد

عہد میر	دور حال	عہد میر	دور حال	عہد میر	دور حال
کاہلوئین	کاہیکو	تدہر	اوسی طرف	بیچ	مین
میں کھیچا	مین نے کھینچا	اور	طرف	لیک	لیکن
زور بیقرار نہ کیا	بہت بیقرار کیا	ماٹی	مٹی	ندان	نادان
رہا	تہا	کنہون نے	کسی نے	چلیان	چلین
کبھو ستی	کبھی سے	وے	وہ	چھوٹا گیا	چھٹ گیا
نماز کرنا	نماز پڑہنا	ہم جانا	ہمنے جانا	جن نے	جس نے

عہد میر میں بعض الفاظ ایسے مستعمل تہے جن کے اعراب آج کل سے مختلف تھے جیسے قفس اور کس کے قافیہ کے ساتہہ سودا کہتے ہین۔

صبا داب تو کر دے قفس سے ہمیں رہا
ظالم پھڑک پھڑک کے پر و بال گھس چلے

اب گھس ہمیشہ بالکسرہ آتا ہے۔

اسی طرح ایک جگہ اور کہیں ابرو کے قافیہ کے ساتہہ سودا کہتے ہیں ؎

سنکے ترک عشق میرا ہنس کے وہ کہنے لگے!
بگڑا ہے کہیں یار و یقین مجھکو نہین

اب مجھکو ہمیشہ بجائے ضمہ جلی کے ضمہ خفی کے ساتہہ نظم ہوتا ہے۔

میر صاحب کے زمانے مین بعض ایسے ٹھیٹھ ہندی الفاظ رائج تہے جنکا بدل اب فارسی یا اوس سے کم ٹھیٹھ ہندی الفاظ سے کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جیسے نگر کے بجائے شہر جگ کی جگہ دنیا وغیرہ۔ مگر سچ پوچھئے تو مزہ انہیں پرانے الفاظ مین ہے۔

عہد میر میں اکثر ایسے الفاظ بھی رائج ہے جو متروک ضرور ہیں مگر اُنکا صحیح بدل اب تک مہیا نہ ہو سکا۔ جیسے تت، ٹک، سو، وغیرہ۔

اُس زمانہ کا رسم الخط بھی آج کل سے کسی قدر مختلف تھا۔ مثلاً اُس زمانہ کے کاتب "آ" "گو" "تو" "کو" "تون" "گو" "کو" "کون" وغیرہ تحریر کرتے تھے۔

میر صاحب کی تصنیفات

میر صاحب کی تصنیفات کو دو شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ نثر۔ نظم۔ نثر میں ان کی چار کتابیں ہیں۔

(۱) فیض میر۔ ایک درسی کتاب بزبان فارسی ہے۔
(۲) تذکرہ نکات الشعرا۔ اس میں بزبان فارسی اردو شعرا کا حال تحریر کیا ہے۔
(۳) ذکر میر۔ بزبان فارسی اپنی سوانحعمری تحریر کی ہے۔
(۴) دریائے عشق۔ بزبان فارسی ایک افسانہ۔

نظم میں حسب ذیل تصنیفات ہیں

۱۔ دیوان قصائد
۲۔ دیوان غزلیات فارسی
۳۔ دیوان غزلیات اردو (چھہ حصوں میں)
۴۔ دیوان فردیات
۵۔ مجموعہ رباعیات، مثلثات، مستزادات، اور مسدسات وغیرہ۔
۶۔ ہفت بند۔
۷۔ مثنوی شکارنامہ آصف الدولہ۔ (تین حصوں میں)
۸۔ مثنوی کتخدائی آصف الدولہ
۹۔ مثنوی مرغ بازی
۱۰۔ مثنوی بے ثباتی دنیا
۱۱۔ مثنوی ساقی نامہ (ایک جشن کے سلسلہ میں)
۱۲۔ مثنوی ہولی (جشن ہولی کا ذکر)

۱۳۔ مثنوی ہولی (ایک دوسرے جشن ہولی کا ذکر)
۱۴۔ مثنوی جھوٹ (جھوٹ سے اظہار نفرت کیا ہے)
۱۵۔ برسات کا سفر
۱۶۔ مثنوی کتے کے حال میں۔
۱۷۔ مثنوی اپنے مکان کی کیفیت
۱۸۔ مثنوی اپنی بلی کے حال میں
۱۹۔ تنبیہ الجہال (جاہل شعرا سے اظہار بیزاری)
۲۰۔ مثنوی ہجو نا اہلان
۲۱۔ مثنوی ہجو مسمیٰ عاقل۔
۲۲۔ مثنوی در شکایت برسات
۲۳۔ مثنوی مذمت آئینہ دار
۲۴۔ مثنوی ہجو آکول
۲۵۔ مثنوی اژدر نامہ
(اپنے عہد کے شعراء کو ایک اژدر بنا کر ہضم کیا ہے)
۲۶۔ مثنوی اپنے کتے اور بلی کی تعریف میں
۲۷۔ مثنوی احوال مرغ
۲۸۔ مثنوی آغا رشید خوشنویس کی مدح میں
۲۹۔ مثنوی ساقی نامہ۔
۳۰۔ مثنوی در معرفت شاعر
۳۱۔ مثنوی اپنے ایک سفر کا احوال۔
۳۲۔ مثنوی شعلۂ عشق
۳۳۔ مثنوی دریائے عشق
۳۴۔ مثنوی جوش عشق
۳۵۔ مثنوی اعجاز عشق
۳۶۔ مثنوی معاملات عشق
۳۷۔ مثنوی خواب و خیال۔

اس طرح میر صاحب کی تعداد تصنیفات اکتالیس تک پہونچتی ہے۔

میر صاحب کی شاعری

میر صاحب کی شاعری جس کا ہر ہر لفظ وجد اور حال کے آسمان کا ایک درخشندہ ستارہ ہے الفاظ کے ذریعہ کسی طرح متعارف نہیں کیا جا سکتی۔ کلام میر کے وہ نکات اور گوشے جو دل کی دنیا میں ہلچل پیدا کر دینے والے ہیں، اسقدر ہیں کہ جن کی تعداد بتانا کم از کم میرے امکان سے باہر ہے محض چند خاص باتیں جو کلام میر کو پڑھکر دماغ میں پیدا ہوتی ہیں۔ اس موقع پر درج کی جاتی ہیں۔

میر صاحب کی خصوصیات شاعری

میرے خیال میں کلام میر کے مطالعہ سے حسب ذیل باتیں ایک ناقد کے سامنے آجانا ضروری ہیں۔

سب سے پہلی خصوصیت میر صاحب کی شاعری کی یہ ہے کہ وہ ایک خطیب کی شان نہیں رکھتی۔ بلکہ خالص اعلیٰ ترین شاعرانہ اصول سے مطابق ہے۔

میر صاحب اپنے اشعار میں بالعموم کسی دوسرے شخص سے تخاطب[1] نہیں رکھتے۔ بلکہ تاثر اور جذبات کے جوش میں بازبار خود کو پکار اٹھتے ہیں۔ رنج والم، شادی و مسرت، غرض جو کیفیات اون کے قلب کو مسمسا کرتی ہیں اون کے اثرات کی کہانی وہ خود ہی کو سنا کر کبھی رو لیتے ہیں اور کبھی شاد ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تصنع کے ناپاک ہاتھ اون کی شاعری تک کبھی نہ پہونچ سکے۔

مولوی شبلی صاحب شعر العجم میں ارشاد فرماتے ہیں

> "شاعر اگر اپنے نفس کے بجائے دوسروں سے خطاب کرتا ہے، دوسروں کے جذبات ابھارنا چاہتا ہے۔ جو کچھ کہتا ہے اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کیلئے کہتا ہے، تو شاعر نہیں خطیب ہے۔"

مولوی صاحب کے اس قابل قدر اصول سے میر صاحب کی شاعری جسقدر مطابقت کرتی ہے اوس کی مثال شاید اردو شاعری میں نہ مل سکے۔ یہی تخاطب فی النفس کا جوش تھا۔ جسکی وجہ سے میر صاحب کی غزلوں میں مقطع تو مقطع مطلعوں اور درمیانی اشعار میں بھی جا بجا اون کا تخلص موجود ہے۔ میر صاحب کے عمدہ اشعار کا اگر انتخاب کیا جائے تو اون میں کم از کم پچیس فیصدی ایسے ضرور ملیں گے جن میں اون کا تخلص موجود ہوگا۔

---

[1] میر صاحب کے عمدہ اشعار میں جہاں کہیں دوسرے سے تخاطب معلوم ہوتا ہے وہاں بھی در اصل وہ کسی سے مخاطب نہیں بلکہ خود اونہی کے خیال نے کچھ تصویریں تیار کر لیں جو میر صاحب کی زبان سے مکالمہ کر رہی ہیں۔

(۲) دوسرے اون کا رنگ اسقدر پختہ اور ہر ایک سے الگ ہے کہ اگر اون کے اشعار سیکڑوں شعرا کے اشعار میں ملاکر رکھدئے جائیں تو بھی ایک معمولی ذوق سلیم رکھنے والا اونکو نہایت آسانی سے علیحدہ کرسکتا ہے۔

تیسرے اون کے اشعار بحیثیت مجموع اون کے کیرکٹر کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ اگر کوئی شخص میر صاحب کے واقعات زندگی سے نابلد ہو اور وہ صرف کلام میر کا بغور مطالعہ کرے تو کم از کم اوسے اون کی زندگی کا خاکہ (out line) معلوم ہوسکتا ہے۔

چوتھے میر صاحب کی تمام عمر چونکہ رنج و مصیبت میں بسر ہوئی تھی لہذا محزونیت اور نشتریت اون کے کلام کا جزو اعظم بن گئے تھے۔

اپنی پر مصائب زندگی میں جو تلخ تجربات انہیں ہوئے تھے وہ اپنے اشعار میں زیادہ تر اونہیں کا ذکر کرتے تھے۔ گویا اون کی شاعری شیلی کے اس قول کے بالکل مطابق تھی۔

Most wretched men are cradled
into poetry by wrong.
They learn in suffering what
they teach in song.

پانچویں میر صاحب کی دائمی ناکامی اور حرماں نصیبی نے اون میں رہبانیت اور ترک دنیا کے خیالات اتنے مستحکم پیدا کردئے تھے کہ اون کی شاعری کا زیادہ حصہ اس نظریہ کا پابند ہوگیا ہے۔

abandon all hope ye that enter here

ترجمہ اے دنیا میں آنے والے اپنی تمام امیدیں قطع کردے۔

دنیا کی قابل نفرت اور ڈراونی تصویر کبھی وہ اس طرح کھینچتے ہیں ؎

یہ عیش گہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے
ہر گل ہے اس چمن کا ساغر بھرا لہو کا!

پھر کبھی ایک عبرت آمیز لہجے میں دنیا کی حقیقت یوں بیان کرتے ہیں ؎

فرصت ہے کم یاں رہنے کی، بات نہیں کچھ کہنے کی!
آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزم جہاں افسانہ ہے

غرض دنیا اور اہل دنیا کے متعلق اسی طرح کے خیالات کا اظہار بالعموم کیا ہے۔

سچ پوچھئے، میر صاحب کے احساسات اتنے قوی تھے کہ اگر قوت متخیلہ غالب ہونے کی حالت میں کسی منظر سانحہ یا تقریبہ کا اثر اون کے دماغ پر بھی پڑتا تھا اور کوئی اچھا ہوا دماغی مضمون پیدا ہوتا تھا تو وہ اوسے اس انداز سے ادا کرتے تھے کہ جس سے سامع کے جذبات اور صرف جذبات ہی متاثر ہوں۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ میر صاحب کچھ علیل ہوئے۔ نواب آصف الدولہ بہادر آپ کو دیکھنے کو تشریف لائے۔ جس بوریہ پر میر صاحب حالت بخار میں بیہوش پڑے ہوئے تھے اوسی کے ایک کونے پر نواب صاحب بھی بیٹھ گئے۔ میر صاحب نے جب ذرا غش سے آنکھیں کھولیں تو نواب صاحب نے پشت کی ایک مرصع تختی جس پر نادعلی کندہ تھی میر صاحب کے گلے میں ڈالدی۔ اس منظر سے میر صاحب پر ایک خاص دماغی اثر ہوا لیکن قوت جذبات نے اوسے فوراً ایک جذباتی شعر کی صورت میں ڈہال دیا ؎

دیوانہ پن ہمارا آخر کو رنگ لایا
جو دیکھنے کو آیا ہاتھوں میں سنگ لایا

دراصل پشت کی تختی گلے میں ڈالی جانا کوئی ایسا فعل نہ تھا جس سے جذبات حرکت میں آتے بس زیادہ سے زیادہ اس فعل سے ایک شکر گذاری کا جذبہ آدمی میں پیدا ہوسکتا تھا۔ لیکن میر صاحب جن کے تمام تصورات اور خیالات عشق کے ہاتھوں بک چکے تھے اس پشت بدست آنے کو عزم سنگ باری کا مرادف سمجھکر کہتے ہیں کہ ہائے آج میرا جنون عشق اس حد پر پہونچگیا ہے کہ جو دیکھنے کو آتا ہے سنگ بدست آتا ہے۔

اس شعر کے ساتھ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ میر صاحب یہ شعر کہتے وقت کس حالت میں
تھے۔ بخار کی وہ شدت کہ غشی طاری ہے۔ کیا ایسی صورت میں کسی کا دماغ حقیقی شعریت
کا تصور بھی کر سکتا ہے؟ در اصل یہ اسی شخص کا کام ہے جو سراپا جذب بن گیا ہو۔
ساتویں، وہ سہل ممتنع میں اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ بالکل سامنے کی باتیں سادی سادی
الفاظ میں کچھ اس طرح نظم کی ہیں کہ بقول ابن رشیق ؎

فاذا قیل اطمع الناس طراً !
واذا ریم اعجز المعجزینا

جب ان کو پڑھا جائے تو ہر شخص یہ سمجھے کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں۔ مگر جب ویسا کہنے کا
ارادہ کیا جائے تو معجز بیان عاجز ہو جائے۔ مثلاً ؎

غیر کے کہنے سے مارا اُن نے مجھ کو بے گناہ
یہ نہ سمجھا وہ کہ واقع میں بھی کچھ تھا یا نہ تھا

آٹھویں، میر صاحب محاکات کے بادشاہ ہیں۔ ایک بڑے سے بڑے آرٹسٹ کا قلم جن چیزوں
کی تصویر کشی نہیں کر سکتا، میر صاحب کے الفاظ اس کا بہترین نقشہ پیش کر سکتے ہیں۔
جیسے ؎

کچھ زرد زرد چہرا کچھ لاغری بدن میں
اس عشق میں ہوا ہے کیا میر حال تیرا

نویں، بعض مقامات پر وہ غلط الفاظ کا استعمال عمداً کر کے صحیح سے زیادہ لطف پیدا کرتے ہیں۔

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی !
دھوم ہے پھر بہار آنے کی !

یہاں گھبراہٹ کا اظہار دوانے سے ہوتا ہے دیوانے سے نہیں ہوتا۔
دسویں، ثقیل اور عامیانہ زبان بھی وہ اس مزے سے کہتے ہیں جس پر سیکڑوں فصحا کے
بیان نچھاور کر دیے جائیں ؎

یوں پکارے ہیں مجھے کوچۂ جاناں والے
ادھر آبے ابے او چاک گریباں والے

گیارہویں، نہایت چھوٹی چھوٹی بحروں میں بھی جن میں کوئی بلند مضمون سمانا مشکل ہوتا ہے بے مثل کہا ہے۔ جیسے ؎

میرؔ بندہ ہے ترا   بولے آزاد کیا ہے

بارہویں۔ میر صاحب کے اشارے قیامت کے ہوتے ہیں جن کی اگر شرح کی جائے تو دفتر کے دفتر بھر جائیں۔ جیسے ؎

بیٹھے تھے میرؔ یار کے دیدار کو سو ہم
اپنا یہ حال کر کے اٹھے انتظار میں

اس موقع پر اگر "یہ" کے بجائے اپنی حالت بد سے بدتر دکھا دیتے تو بھی یہ لطف نہ پیدا ہوتا۔

تیرہویں۔ شعر کی بندش اس قدر سلجھی ہوئی رکھتے تھے، جس کی تعریف امکان سے باہر ہے۔ جیسے ؎

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

چودہویں۔ اکثر وہ بسیط مطالب کو سمجھنے کیلئے خالص فارسی ترکیبوں سے مصرع لگاتے ہیں۔ جیسے ؎

یک بیاباں برنگ صوت جرس
مجھ پہ ہے بے کسی و تنہائی!

پندرہویں۔ اکثر وہ محاورات بھی نہایت عمدہ طریقے پر نظم کرتے ہیں۔ جیسے ؎

شکوہ آبلہ ابھی سے میرؔ   ہے گی پیارے ابھی تو دلی دور

سولہویں۔ ان کا انداز بیان ایسا کامیاب ہے کہ وہ اکثر فرسودہ باتوں میں بھی جان ڈال دیتے ہیں۔ جیسے ؎

گر ہو نہ خفا تو کہہ دوں جی کی!
اِس دم مجھے یاد ہے کسی کی

یہی مضمون شعرا نے سیکڑوں طرح سے کہا ہے لیکن شاید کوئی میر کی گرد بھی نہ پا سکا ہو۔

سترہویں۔ وہ اپنے کلام میں اکثر مکارم اخلاق پر بھی ایک نہایت دلچسپ انداز سے روشنی ڈالتے ہیں۔ جیسے ؎

معیشت ہم فقیروں کی سی اخوان زماں سے رکھ
کوئی گالی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا

اٹھارویں۔ بعض جگہ وہ اپنے تجربات کی بنا پر کچھ آزادِ حکیمانہ اصول بھی بیان کرتے ہیں۔ جیسے ؎

شرط سلیقہ ہے ہر اک کام میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے!

انیسویں۔ تکرار الفاظ سے وہ اپنے اشعار میں خاص لطف پیدا کرتے ہیں۔ جیسے ؎

بدنامی عشق کی کیا کہیے رسوائی سی رسوائی ہے
صحرا صحرا وحشت بھی اور عالم عالم تہمت تھی

بیسویں۔ بعض جگہ انہوں نے ایسے شعر بھی کہے ہیں جن میں کوئی بدیشی لفظ نہیں آنے پایا۔ جیسے ؎

اب کہتے ہیں یہ کہتے یہ کہتے جو وہ آتا!
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

اکیسویں۔ ان کے اشعار میں معاملات عشق بہترین طریقہ پر ملتے ہیں۔ جیسے ؎

جی میں تہا اوس سے ملئے تو کیا کیا کہئے میرؔ
پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھکر

بائیسویں۲۲ - اون کے اکثر اشعار اپنی مقبولیت کی وجہ سے ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ جیسے

کہلا جو نشہ میں پگڑی کا پیچ اوس کی میرؔ
سمند ناز کو اک اور تازیانہ ہوا!

تیئسویں۲۳ - بڑی بحروں میں جادو نگاری اون کا حصہ تہا۔ جیسے ے

دل کی کچہہ تقصیر نہیں ہے آنکہیں اوس سے لگ پڑیاں
مار رکہا سو اون نے مجہہ کو کس ظالم سے جا لڑیاں

میر صاحب کی شاعری کے متعلق غلط فہمیاں

اسی سلسلہ میں یہہ بہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کی شاعری پر دنیائے صحافت میں جن غلط خیالات کا اظہار ہوا ہے اون پر بہی کچہہ روشنی ڈالدی جائے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ میرؔ یوں تو بہت اچہے شاعر تہے مگر رفعت تخیل اون کے یہاں کمیاب ہے۔

میرے خیال میں اس اعتراض کی تہہ میں دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو معترض حضرات رفعت تخیل کا صحیح مفہوم نہیں سمجہتے یا انہوں نے کلام میرؔ کا مطالعہ عقل کی آنکہیں بند کرکے کیا ہے۔ اگر معترضین رفعت تخیل کا مفہوم "آ ہوئے دشت جنوں پہ لیلائے پہاڑ" سمجہتے ہیں تو صریح غلطی ہے جس کا فیصلہ محض ذوق سلیم کر سکتا ہے۔

"رفعت تخیل دراصل دو چیزوں میں ایسا واسطہ دکہانے کا نام ہے جسے خواص کی نظریں بہی نہ دیکہہ سکتی ہوں۔

کلام میر پر اس نظریئے کی روشنی میں اگر ایک سرسری نظر بہی ڈالی جائے تو رفعت تخیل کے

اتنے نمونے ملیں گے جن کی مثال کسی اُردو شاعر کے یہاں مشکل دستیاب ہو سکے گی۔

صرف میر صاحب عام شاعروں کی طرح اپنے تخیل کو عریاں نہیں چھوڑ دیتے بلکہ اوس پر سلاست شستگی اور نرمی کا رنگ ایسا چڑھا دیتے ہیں کہ الجھاؤ اور ثقل جو تخیل میں بالعموم پایا جاتا ہے بالکل جاتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کی نظر میں اکثر دھوکہ کھاتی ہیں۔ مثال کے طور پر میر صاحب کے دیوان کی سب سے پہلی غزل پیش کرتا ہوں اور معترض حضرات کو چیلنج کرتا ہوں کہ اس میں کوئی ایسا شعر نکالدیں جسمیں رفعت تخیل مفقود ہو۔

غزل

تھا مستعار حسن سے اوسکے جو نور تھا — خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

ہنگامہ گرم کن جو دل ناصبور تھا — پیدا ہر ایک نالے سے شور نشور تھا

پہونچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں — معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم! — یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا

محفل میں رات ایک ترے پرتوے بغیر — کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر — اوس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

ق

کل پاؤں ایک کاسہ سر پہ جو آگیا! — یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھو کسی کا سر پر غرور تھا

تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم یہ فہم کا اپنی قصور تھا

غزل کی دنیا میں اس سے بڑھکر رفعت تخیل کی مسلسل مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟ کچھ لوگ میر صاحب پر یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ "اونکے کلام میں شادابی بالکل نہیں"

یہ اعتراض بھی بالکل غلط صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ یہہ کہا جا سکتا ہے کہ محزونیت اور نشتریت کے مقابلہ میں میکش صاحب کے یہاں شادابی کم ہے جس کا واحد سبب ان کا پرالم ماحول ہے۔ لیکن فقدان شادابی کے خیال کی تردید خود میکش صاحب کے حسب ذیل شعر پوری طرح کر سکتے ہیں۔

قطعہ

جاگے تھے ہمارے بخت خفتہ — پہونچا تھا ہم وہ اپنے گھر رات
تھی صبح جو منہہ کو کھول دیکھا — ہر چند کہ تب تھی ایک پہر رات
پھر زلفوں میں منہ چھپا کر بولا — اب ہوئے گی میکش کسقدر رات

---

۲ سہ
ابر اٹھا تھا کعبہ سے اور جھوم پڑا میخانہ پر
بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے گا شیشہ اور پیمانہ پر

۳ سہ
اب جو نسیم معطر آئی شاید اسکے بال کھلے
شہر کی ساری گلیاں ہو گئیں گویا عنبر سارا آج

۴ سہ
شوق قامت میں ترے اے نونہال
گل شاخیں لیتی ہیں انگڑائیاں!

۵ سہ
یا بادۂ گلگوں کی خاطر سے ہوس جائے
یا ابر کوئی آئے اور آکے برس جائے

۶ سہ
یاد آئی کسی کی چال سے مجھے!
ہم نشیں میں چلا سنبھال سے مجھے!

اسی طرح ہزاروں شاداب اشعار دیوان میر میں مل سکتے ہیں۔

اب رہی یہ بحث کہ شاداب اشعار کی کمی میر صاحب کے مرتبہ شاعری کو کچھ پست کرتی ہے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں میں صرف شیلی کے اوس قول کو نقل کر دینا چاہتا ہوں جس میں اوس نے اعلےٰ ترین شاعری کی تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے ۔

Our deepest songs are those that tell us of saddest thought

ترجمہ - ہمارے عمیق ترین اشعار وہ ہیں جو ہمیں شدید ترین درد و غم سے مطلع کریں"۔

گویا بالفاظ دیگر شیلی کے خیال میں اعلیٰ شاعری محزونیت اور نشتریت ہی - نہ کہ شادابی اور شگفتگی اور حقیقت بھی یہی ہے۔ شاعری دراصل آہ کا نام ہے جو دل سے نکلنے کے بعد بھی مدتوں تک اپنی یاد دل میں چھوڑ جاتی ہے لیکن اس کے برخلاف خندہ محض ایک فریب احساس ہے جس کی عمر چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں ہوتی۔

آیت :- فلیضحکوا قلیلاً ولیبکوا کثیراً بھی اس مطلب پر روشنی ڈالتی ہے۔

میر صاحب کی شاعری کا مقصد عیاشانہ جلسوں کی زینت نہیں بلکہ حقیقتاً وہ اپنے تجربات اور پرعبرت فلسفیانہ خیالات بیان کرکے دنیائے دنی سے نفور کی تعلیم دیتے ہیں - چنانچہ خود میر صاحب نے بھی اپنی شاعری کے متعلق اسی قسم کا خیال ظاہر کیا ہے ؎

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد دل کتنے جمع تو دیوان کیا !!

میر صاحب پر ایک اور اعتراض یہ بھی ہے کہ ان کی استعداد علمی بہت کم تھی۔ وہ دلیل میں اون کی وہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن میں لغت کا غلط استعمال کیا گیا ہے مثلاً مسجد کو مسبت - پلید کو پلیت - دستخط کو دسخط - نزدیک کو نزیک - شتاب کو شتابی۔

اضطراب کو اضطرابی وغیرہ وغیرہ۔

اس اعتراض کا جواب دینے سے قبل یہ بتا دینا ضروری ہے کہ غلطی کہتے کسے ہیں؟ دراصل غلطی وہ ہے کہ جس کا ارتکاب حالت لاعلمی میں ہو فعل عمد کو غلطی کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔ میر صاحب کو اس کا پورا علم تھا کہ یہ الفاظ عربی اور فارسی لغت کی رو سے غلط ہیں۔ لیکن بقول خود بحیثیت اردو شاعر کے وہ جامع مسجد دلی کی سیڑھیوں پر بولی جانے والی زبان کی پابندی اپنا فرض سمجھتے تھے۔

میر صاحب کی خود نوشت سوانح عمری "ذکر میر" سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی وہ کم از کم مطول تک[1] ضرور پڑھ چکے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے فارسی انشا اور فارسی شاعری سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ فارسی کے بھی ایک اچھے ادیب تھے جس کے بعد ظاہر ہے کہ وہ مسجد، مشتاب اور نزدیک وغیرہ جیسے عام الفاظ کے لغوی نوعیت سے کسی طرح ناواقف نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ انہوں نے ان الفاظ کا غلط استعمال کیا بالکل لغو ہے۔ دراصل عہد میر کی زبان بھی یہی تھی جس پر آج اجتہاد کا ہمیں کوئی حق نہیں۔

خود دورحال کی اردو میں آج سیکڑوں لفظ ایسے رائج ہیں جو اصولاً بالکل غلط ہیں۔ جیسے

لغت میں ہے مُتَقَیَّش بروزن مُشَوَّش لیکن استعمال مُقَیِّش (بالضم ہیم وقاف مشدد) ہوتا ہے۔

اولاد ولد کی جمع ہے لیکن بصیغۂ واحد مستعمل ہے۔

ऋतु اصل ہندی لفظ ہے لیکن رُت بولا جاتا ہے۔

[illegible] اصل ہندی لفظ ہے لیکن سوارنت کہا جاتا ہے۔

ماہرین علم السنہ جانتے ہیں کہ ایک زبان کے لفظ دوسری زبان میں کس کس طرح بگڑ کر استعمال ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر عہد میر کی اردو میں ایسا ہوا تو کیا بیجا تھا۔

---

[1] آگے ذکر میر کی وہ عبارت نقل کی گئی ہے۔

آپ یوں سمجھ لیجئے کہ اصل عربی لفظ مسجد تھا لیکن عہد میر کی اردو میں بگڑ کر وہ مسیت ہو گیا وبیگر متذکرہ بالا الفاظ کی بھی یہی صورت ہوئی۔ اس میں محل اعتراض کیا ہو سکتا ہے تمام زبانوں میں روز یہی تماشے ہوا کرتے ہیں۔
ان اعتراضات کا جواب دینے کے بعد میں میر صاحب کا مختلف اصناف کا کلام مع تبصرہ پیش کر کے یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ وہ کس پائے کے شاعر تھے۔

میر صاحب کی غزل گوئی

قبل اس کے کہ میں میر صاحب کی غزل گوئی سے بحث شروع کروں یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ صنف غزل گوئی پر کسیقدر روشنی ڈالدوں۔
گو غزل کے لغوی معنی "بازناں گفتگو کردن" ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں کہ اصطلاح شاعری میں غزل اوس کلام پا شان کو کہتے ہیں جو مطالب حسن و عشق کو بے نقاب کرے۔
اس صنف کا نام غزل محض اس کی دو معنوی خصوصیتوں کی وجہ سے ہوا ہے پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ بالعموم عورات سے جو گفتگو کی جاتی ہے وہ کسی خاص بحث کے تحت میں نہیں ہوتی بلکہ کلام پاشان کی صورت میں مختلف دلچسپ موضوعات سے متعلق ہوا کرتی ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ صنف نازک سے جو گفتگو ہوتی ہے اُسکا تعلق کسی نہ کسی صورت میں حسن و عشق سے ضرور ہوتا ہے۔ انہیں دونوں باتوں کو پیش نظر رکھکر اس صنف کا نام غزل رکھا گیا۔
یہ خیال بالکل غلط ہے کہ غزل کا اصلی مفہوم بازناں گفتگو کردن ہے۔ فارسی اور اردو میں آجتک سیکڑوں بڑے سے بڑے غزل گو ہوئے ہیں۔ اگر حقیقتاً اس صنف کا مفہوم بازناں گفتگو کردن ہوتا تو آخر ان میں سے کوئی تو اس اصول کی پابندی کرتا۔

ابتدائً غزل کے تحت میں صرف حیات معاشقہ ہی تھی لیکن جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا عشق کا مطمح نظر بھی بلند ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ عرفان کو جزوِ عشق قرار دیکر موضوع تصوف کو بھی غزل میں داخل کیا گیا۔ تصوف کے شامل غزل ہونے کے بعد مسائل تصوف کی توضیح کے لئے اخلاق اور حکمت کی ضرورت پڑی جس کی وجہ سے موضوع اخلاق اور موضوع حکمت کو بھی غزل کا ایک شعبہ قرار دینا پڑا۔ ان تمام موضوعات کے مخلوط ہونے کے بعد صنف غزل کی موجودہ صورت میں تشکیل ہوئی۔

چونکہ غزل کا نفس موضوع حسن و عشق خالصاً وجد سے متعلق ہے لہذا یہ ضروری ہے کہ غزل کے تمام اشعار وجدانی ہوں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی غزل گو اوس وقت تک کامیاب نہ ہو سکیگا جب تک اوس میں وجد نہ ہو۔ اور وجدانا نہیں اوس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک وہ آزاد منش، بے نیاز، فارغ، خود دار اور گرفتہ دل نہ ہو۔

اس اصول کی روشنی میں اگر غور سے دیکھا جائے تو میر صاحب سے زیادہ مناسب کیرکٹر غزل گوئی کیلئے کسی دوسرے شاعر کا شاید بمشکل مل سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس صنف میں خصوصیت کے ساتھ میر صاحب نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ کم از کم اردو میں کسی غزل گو کو نصیب نہیں ہوئی۔

میر صاحب کی اردو غزلیات کے چھہ دیوان ہیں۔ جو بڑے سائز کے تقریباً (۴۵۰) ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان دواوین میں رطب و یابس سب کچھہ ہے۔ لیکن اگر انتخاب کرکے انکا ایک ثلث لے لیا جائے تو ایک بہترین گلدستہ تیار ہو سکتا ہے۔

اب میں ذیل میں غزل گوئی کے کچھہ مسلم اصول درج کرکے اون کے تحت میں میر صاحب کا کچھہ کلام پیش کرتا ہوں جس سے صنف غزل میں اونکے کمال کا بآسانی اندازہ ہو جائیگا۔

غزل کا پہلا اصول سب سے پہلا اصول غزل گوئی کا یہ ہے کہ غزل کے اشعار میں جو الفاظ استعمال کئے جائیں وہ نہ اتنے عامیانہ ہوں کہ تہذیب منھ دیکھکر رہ جائے۔ نہ اتنے ثقیل ہوں جو بالعموم مستعمل نہ ہوں بلکہ ایک موثر پر جذبات اور شستہ زبان میں ادائے مطلب کرنا چاہئے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ صنائع اور بدائع سے قطعاً پرہیز کرنا چاہئے۔ کیونکہ تاثر اور صنائع و بدائع دو متضاد چیزیں ہیں جو یکجا نہیں ہو سکتیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ میرؔ صاحب نے اس اصول کی کس حد تک پابندی کی ہے مثال کے طور پر چند شعر درج ذیل کئے جاتے ہیں جو میرؔ صاحب کے انداز بیان کا نمونہ ہیں ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے ۔۔۔ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

آج پھر تھا بے جمعیت میرؔ واں! ۔۔۔ کل لڑائی سی لڑائی ہو چکی!

خون جگر ہو بہنے لاگا ۔۔۔ پلکوں ہی پر رہنے لاگا!

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا ۔۔۔ دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا ۔۔۔ آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

وجہ بیگانگی نہیں معلوم ۔۔۔ تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

سر سبز کیں لیک وہ پرکار ۔۔۔ دیکھو تو مہربان ہے گویا

ان اشعار کے حسن بیان اور حسن زبان کا اندازہ کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اپنی جدید اردو کو تھوڑی دیر کیلئے فراموش کرکے دور آصفی کے کسی مشاعرہ کا تصور کیا جائے۔ جہاں لوگ عجیب و غریب پوشاکیں پہنے اپنی پرانی اردو میں غزل سرائی کر رہے ہیں پھر دیکھئے کہ ان اشعار کے ایک ایک لفظ کی قیمت کیا ہو جاتی ہے۔

اب رہی صنائع و بدائع کی بحث۔ اس کے متعلق میں نہایت یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میر صاحب اس شعریت کش شے سے ہمیشہ الگ رہتے تھے۔ جہاں کہیں شاذ و نادر ان کے کلام میں صنائع و بدائع کی مثالیں ملتی ہیں انہیں میر صاحب نے عمداً نہیں کہا۔

دوسرا اصول دوسرا اصول غزل گوئی کا یہ ہے کہ غزل میں تشبیہات اور رعایات لفظی طبعی انداز تک مستحسن ہیں لیکن افراط سخت مذموم ہے۔ کیونکہ افراط تشبیہات و رعایات لفظی سے شعر میں تصنع پیدا ہو جاتا ہے جس سے حقیقی شعریت بالکل جاتی رہتی ہے۔

گو طبعی انداز کا احساس کرانے کیلئے انسان کے پاس سوائے ذوق سلیم کے اور کوئی ذریعہ نہیں لیکن پھر بھی اس خیال کو ان الفاظ میں ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ طبعی تشبیہات اور رعایات لفظی وہ ہیں جو بلا ارادہ آمد میں بالقلب پیدا ہوں۔ مثلاً ایک آدمی کسی غیر معمولی قد و قامت کے آدمی کو دیکھتا ہے اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلتا ہے "کہ اُف یہ شخص تو بالکل دیو ہے" چونکہ اس تشبیہ میں تصنع مطلق نہیں اور قلب کے کسی عمیق گوشے سے نکلی ہے لہذا اسے طبعی تشبیہ کہا جائے گا۔ لیکن اگر اس غیر معمولی قد و قامت کے آدمی سے تشبیہ دینے کے لئے دماغ کی مدد لیکر دنیا کی بڑی بڑی عظیم الجثہ اشیاء کی فہرست پر ایک نظر انتخاب ڈالی جاتی اور اس کے بعد کسی شے کو منتخب کر کے اس سے تشبیہ دی جاتی تو یہ تشبیہ غیر طبعی ہو جائے گی۔

بہر حال مختصر یہ کہ کیف شعری پر جن تشبیہات کا خراب اثر پڑے وہ قطعاً غزل میں ناجائز ہیں۔ جیسے حسب ذیل شعر دامان غزل پر ایک داغ ہے ؎

بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کے
مطلب یہ ہے کہ بھیجدیں آنکھیں نکال کے

یہی صورت طبعی رعایت لفظی کی ہے۔ طبعی رعایت لفظی کا مفہوم یہ ہے کہ آپسمیں معنوی تعلقات رکھنے والے الفاظ اگر شعر میں آئیں تو اس طرح کہ ادنےٰ کیف شعری نہ جانے پائے۔ غیر طبعی رعایت لفظی کی مثال امانت کا یہ مصرع ہے۔ ع

بیر بوٹیوں میں بھی مرا نازک بدن ملتا نہیں

میر صاحب کے کلام کا گوشہ گوشہ چھان ڈالئے لیکن کسی جگہ غیر طبعی تشبیہات، یا رعایت لفظی نہ ملینگی۔ اور جہاں کہیں ملیں گی تو طبعی حدود کے اندر رہوں گی۔ تشبیہ سے

تشبیہات

سلہ
یہ عیش گہہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے
ہر گل ہے اس چمن کا ساغر بھرا لہو کا !

دنیا کی تشبیہہ ایک ایسے چمن سے دی ہے جس میں پھولوں کی جگہ خون سے بھرے ہوئے پیالے ہیں۔

سلہ ۲
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

بجھتے ہوئے دل کی تشبیہہ مفلس کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ سے دی ہے۔

سلہ ۳
کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

پیچاں موج ہوا کو زنجیر سے مشابہ قرار دیا ہے۔

سلہ ۴
کم فرصتی جہاں کے مجمع کی کچھ نہ پوچھو
احوال کیا کہوں میں اس مجلس رواں کا

مجمع عالم کی تشبیہہ مجلس رواں سے دی ہے۔

(۵)
برقع اُٹھنے پہ اوس کے ہوگا جہاں روشن
خورشید کا نکلنا کیوں کر چھپا رہے گا!

بے نقابی روئے محبوب کی تشبیہہ طلوع آفتاب سے دی ہے۔
مندرجہ بالا تشبیہات کو اگر بغور دیکھا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ میر صاحب کسی مقام پر طبعی حدود سے متجاوز نہیں ہوئے ہیں بلکہ اون کی تمام تشبیہات میں خود ایک شعریت مضمر ہے۔ اب رعایت لفظی کی مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

رعایات لفظی

(۱)
موجیں کرے ہے بحر جہاں میں ابھی تو تو
جانے گا بعد مرگ کہ عالم حباب تھا

بحر جہاں میں موجوں سے حباب پیدا کیا ہے۔

(۲)
بہار رفتہ پھر آئے ترے تماشے کو
چمن کو یمن قدم نے ترے نہال کیا

بہار کی رعایت سے نہال لائے ہیں۔

(۳)
جی میں ہے یاد رخ و زلف سیہ فام بہت
رونا آتا ہے مجھے ہر سحر و شام بہت

زلف و رخ کی رعایت سے سحر و شام کہا ہے۔

(۴)
عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں
اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں

آنکھیں لگنے کی رعایت سے خواب لایا گیا ہے

ضعف یاں تک کھچا کہ صورت گر
رہ گیا ہاتھ میں قلم سے کر! (۵)

صورت گر کی رعایت سے کھچا کہا ہے۔
یہ تھیں میر صاحب کی رعایات لفظی کی مثالیں جنکو دیکھکر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ تاثیر کا فقدان کسی مقام پر نہیں ہونے پایا ہے۔ طبعی انداز اسی کا نام ہے۔

تیسرا اصول تیسرا اصول غزل گوئی کا یہ ہے کہ غزل کہنے والے کو حتی الوسع مبالغہ سے پرہیز کرنا چاہیے۔ لیکن اگر مبالغہ اس صورت میں کیا جائے کہ تاثیر شعر مفلوج نہ ہونے پائے تو کوئی ہرج نہیں۔ بلکہ اس قسم کے مبالغے دنیائے غزل میں بھی مستحسن سمجھے جاتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مبالغہ غزل میں بہر صورت لغو ہے۔ لیکن واقعتاً ایسا نہیں اس میں شک نہیں کہ اکثر مبالغے تاثیر شعری کو ختم کر دیتے ہیں۔ لیکن ہر مبالغہ کے لئے یہی رائے کسی طرح قائم نہیں کی جا سکتی۔ یہ ایک مسلم بات ہے کہ منجملہ دیگر محاسن کے مبالغہ بھی حسن کلام اور زینت کلام ہے۔ کسی خیال میں تاثیر کی روح پھونکنے کیلئے جہاں اور بہت سی باتیں ماہرین علم کلام کے نزدیک ضروری ہیں وہیں مبالغہ بھی ایک نہایت اہم چیز ہے۔

کسی خیال کو ظاہر کرنے کی بجز دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ اپنے مطلب کو بالکل سادہ طریقہ پر من وعن ظاہر کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اسے رنگ آمیزی کے ساتھ سامع کے سامنے پیش کیا جائے۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے کم از کم آخر الذکر صورت میں مبالغہ کو نظر انداز کرنا صرف مشکل نہیں بلکہ محال قطعی ہے۔

مثلاً اگر ایک شخص ایک خوبصورت گلاب کے پھول کو دیکھے اور جو تاثیرات

اس منظر سے اوس کے دل پر پیدا ہوں، اون کو ظاہر کرنا چاہے تو اس کے پاس صرف دو ذریعے ہیں۔ ایک یہ کہ سادگی سے وہ اپنے مطلب کو اس طرح سے ادا کرے کہ :۔

"میں نے ایک خوبصورت گلاب کے پھول کو دیکھا جو ہری بھری پتیوں کے جھنڈ میں نہایت دیدہ زیب معلوم ہوتا تھا۔"

لیکن اگر وہ اپنے مطلب کو کسی رنگین پیرایہ میں ادا کرنا چاہتا ہے تو وہ قدرتاً اس بات پر مجبور ہے کہ قوت مبالغہ سے کام لیکر اپنا خیال اس طریقہ پر ظاہر کرے۔

"میں نے ایک خوبصورت گلاب کے پھول کو دیکھا جو پتیوں کے سبز فرش پر آرام کر رہا تھا۔ اس پھول کے نظارہ میں میں ایسا محو ہوا کہ میرے پاؤں گویا زمین نے پکڑ لئے اور میں اپنی جگہ سے مطلق جنبش نہ کر سکا۔"

بہرحال حاصل کلام یہ ہے کہ کم از کم ایک شعبۂ کلام ایسا ضرور ہے کہ جس میں مبالغے کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔ ہاں اس بات کا خیال ضروری ہے کہ مبالغہ غیر طبعی صورت نہ اختیار کرنے پائے۔

غیر طبعی مبالغہ کی تعریف ان الفاظ میں ہو سکتی ہے کہ جو مبالغہ شعر کے کیف یا رس کو ضائع کر دے وہ غیر طبعی ہے۔ جیسے ؎

کہاں ہے کس طرف ہے اور کدھر ہے
سنا جاتا ہے اون کے بھی کمر ہے
جرأت

یہ شعر دراصل شرنگار رس یا عاشقانہ رنگ میں کہا گیا ہے۔ لیکن اس مبالغہ کی وجہ سے کیف عاشقانہ سے کوسوں دور ہو گیا ہے کیونکہ اسے پڑھکر کسی کے جذبات عشق ذرا بھی متاثر نہیں ہو سکتے۔ بلکہ بجائے جذبات عشق بر انگیختہ ہونے کے یہ جذبات ظرافت کو متحرک کرتا ہے جس کا مطلب صاف لفظوں میں یہ ہوا کہ شاعر جس کیفیت کو ظاہر کرنا چاہتا تھا اس میں بالکل ناکام رہا۔

کچھ محققین کی رائے ہے کہ مبالغہ ہر حالت میں تاثیر شعری کے لیے سم قاتل ہے۔ لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا مبالغہ بھی اگر اوسی کیف یا رس کے حدود میں رہ کر کیا گیا ہے جس کی شاعر ترجمانی کر رہا ہے تو وہ کسی طرح تاثیر شعری کو مفلوج نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر ذیل کا شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

نازکی اوسکے لب کی کیا کہیے ؟
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میر

معشوق خواہ کتنا ہی نازک کیوں نہ ہو لیکن اوس کے لب کو گلاب کی پنکھڑی کہنا کھلا ہوا مبالغہ ہے۔ مگر چونکہ کیف مقصود سے شعر متجاوز نہیں ہوا ہے لہذا کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے۔

کچھ باتیں اور بھی طبعی مبالغہ کی شناخت کے سلسلہ میں ذہن میں آتی ہیں جن کو اس موقع پر درج کیے دیتا ہوں۔ میرے خیال میں حسب ذیل قسم کے مبالغے طبعی کہے جا سکتے ہیں۔

اول وہ مبالغے جو روزمرہ کی بول چال سے از خود پیدا ہو جاتے ہیں۔ جیسے ؎

ہر آن مجھکو تجھ بن اک اک برس ہوا ہے
کیا آگیا زمانہ اے یار رفتہ رفتہ
میر

دراصل اس موقع پر شاعر ہجر کے ایک ایک آن کو ایک ایک برس کے برابر دکھانا نہیں چاہتا تھا بلکہ اس کا مقصد اس فطری بات کا اظہار تھا کہ اوقات ہجر بجد طولانی ہوتی ہیں لیکن اردو کے محاورے (ایک ایک آن ایک ایک برس) نے اس شعر میں ایک مبالغے کی صورت پیدا کر دی ہے۔

ایسے مبالغے اول تو مبالغے ہی نہیں کہے جا سکتے۔ اور اگر بالفرض اون کو مبالغہ کہہ بھی لیا جائے تو انہیں طبعی تسلیم کرنے میں کسی کو عذر نہیں ہو سکتا کیونکہ ان سے تاثیر شعری ذرا بھی مفلوج نہیں ہوتا۔

دوسرے وہ مبالغے جن میں ایک چیز کی اہمیت بڑھانے کیلئے دوسری زیادہ اہم چیز

کی صورت میں اس طرح پیش کیا جائے کہ سامع کے سامنے وہ اصل اہم شئے نہ آئے جسکی صورت میں شاعر نے ایک غیر اہم شئے کو پیش کیا ہے بلکہ ذہن اس شئے کی ایک شاعرانہ جذباتی تصویر تراش لے۔ جیسے میر صاحب کہتے ہیں ؎

ظلم ہے، قہر ہے، قیامت ہے
غصہ میں اوس کے زیر لب کی بات
میر

محبوب کی پر قہر گفتگو کو قیامت وغیرہ کہنا صریح مبالغہ ہے۔ لیکن اس قیامت کا مفہوم کوئی شخص قیامت صغرا یا قیامت کبریٰ نہیں سمجھ سکتا۔ اس قیامت سے ہر شخص وہی قیامت مراد لے گا جو معشوق کے غصہ سے دل کی دنیا میں برپا ہو جاتی ہے۔

تیسرے۔ وہ مبالغے جن کا وقوع جذبات کی دنیا میں برابر ہوتا رہتا ہے۔ لیکن مادی عالم میں وہ ناممکن الوقوع معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے ؎

کیا چال یہ نکالی ہو کر جوان تم نے
اب جب چلو ہو دل کو ٹھوکر لگا کرے ہے
میر

معشوق زمین پر چلے اور عاشق کے دل کو ٹھوکر لگے۔ یہ بات بظاہر ناممکن الوقوع معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جذبات کی دنیا میں یہ صورتیں روز پیش آیا کرتی ہیں۔ جنہیں شاید منطقیوں کی مادہ پرست نظریں کسی طرح نہ دیکھ سکیں۔

بہر حال طبعی مبالغوں کے لئے بہت سی باتیں اور بھی لکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس تمام بحث کی تہہ میں وہی بنیادی اصول ہے جسے میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ

"طبعی مبالغہ وہی ہے جس سے اس کیف شعری (رس) کی مخالفت نہ ہو جسمیں شاعر اپنے شعر کو پیش کر رہا ہے۔"

اب اس اوصول کی روشنی میں میر صاحب کے مبالغوں پر مکرر نظر ڈالیئے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

دل نہ پہونچا گوشۂ داماں تلک ۔۔۔ قطرۂ خون تھا مژہ پر جم رہا

تربت سے عاشقوں کی نہ اٹھا کبھو غبار ۔۔۔ جی سے گئے ولے نہ گئیں رازداریاں

گرمی عشق مانع نشو و نما ہوئی ۔۔۔ میں وہ نہال تھا کہ اگا اور جل گیا

مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ ساغر نہ ہووے گا ۔۔۔ مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی ۔۔۔ ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

مندرجہ بالا اشعار میں زبردست سے زبردست مبالغے موجود ہیں۔ لیکن کوئی شعر مبالغے کے طبعی حدود سے متجاوز نہیں ہونے پایا ہے۔ تاثر اور دلکشی ان کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ یہی وہ صورتیں ہیں جن میں مبالغے مستحسن سمجھے جاتے ہیں۔

چوتھا اصول

غزل میں شوخ مضامین جائز ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ تہذیب کے حدود سے متجاوز نہ ہونے پائیں۔ کیونکہ اس صورت میں شعر کا کیف (رس) ضائع ہو جانے کا پورا احتمال ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ شوخ مضامین غزل میں نہ ہونا چاہیئے لیکن میری رائے اس سے کسی قدر الگ ہے۔

میرے خیال میں شوخ مضامین جو تہذیب کی حدود سے متجاوز نہ ہوں غزل گوئی کے بنیادی اصول عشق کے خلاف نہیں ہو سکتے۔ مگر اتنا میں بھی مانتا ہوں کہ ان مضامین کی اکثریت کا اثر بالعموم احساس شہوانیہ پر ہوتا ہے۔ لہذا ایسے مضامین غزل میں درجہ اول کے مضامین نہیں سمجھے جا سکتے۔ کیونکہ شہوانیہ عشق ایک ادنیٰ درجہ کا عشق مانا گیا ہے۔ ہاں اگر شوخ مضامین اس صورت میں کہے جائیں کہ اعلیٰ سی حظ روحانی حاصل ہو سکے تو البتہ ان کا مرتبہ نہایت بلند ہو جائے گا اور وہ اعلیٰ ترین قسم کی غزل گوئی میں جگہ پا سکیں گے۔

میرؔ صاحب نے اپنی غزلوں میں بعض جگہ شوخ مضامین بھی کہے ہیں جن کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا اثر احساس شہوانیہ پر مطلق نہیں پڑتا بلکہ صرف روح کو محظوظ کرتے ہیں۔ نمونتاً مشتے از خروارے ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں ؎

دونوں اوسکے ساعد سیمیں ہاتھ میں لاکر چھوڑ دیئے
(۱) بھولے اوس کے قول و قسم پر ہائے خیال خام کیا

اس شعر میں صرف ساعد سیمیں ہاتھ میں لینا ایک ایسی چیز ہے جس کا اثر احساس شہوانیہ پر پڑ سکتا ہے۔ لیکن میرؔ صاحب "چھوڑ دیئے" کا ٹکڑا مصرعہ اولیٰ میں لاکر اس ادنیٰ قسم کے تاثر کو بالکل ختم کر دیتے ہیں جس کے بعد حقیقی شاعری کے اصول کے مطابق ایک روح پر اثر کرنے والے لہجے میں کہتے ہیں ؎

بھولے اوس کے قول و قسم پر ہائے خیال خام کیا

یہی مصرع اس شعر کا حاصل ہے۔ کیونکہ شاعر اس شعر میں محض معشوق کے قول و قسم پر روشنی ڈالنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس مصرعے سے سوائے حظ روحانی کے کوئی شہوانی لطف حاصل نہیں ہو سکتا۔

لعل خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں
(۲) پھر پوچھتے ہو ہنس کر مجھ بے نوا کی خواہش

حاصل شعر طلب بوسہ کے علاوہ کچھ نہیں لیکن انداز کلام کچھ ایسا ہے کہ اس مطلب کو اس عنوان سے ظاہر نہیں کیا کہ سننے والے کوئی شہوانی لطف حاصل کر سکیں۔ بلکہ لہجہ ایسا پر درد رد کہا ہے جس کا اثر سوائے روح کے اور کسی شے پر پڑ ہی نہیں سکتا۔ شعر کو پڑھ کر در اصل جو صورت نمایاں طور پر سامنے آتی ہے وہ طلب بوسہ نہیں بلکہ محبوب کی شوخی اور عاشق کی مایوسی ہے۔ اس صورت کو میرے خیال میں کوئی شخص موثر عن الشہوۃ نہیں کہہ سکتا۔

(۳) چشم نم سے ہر جھپکے ہے!
صدقے اس آنکھڑیاں لڑانے کے

محبوب کی شوخ نظری کی وہ تصویر کھینچی ہے کہ روح وجد میں آجاتی ہے۔

(۴) دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا
تاکنا جھانکنا کبھو نہ گیا!

اللہ رے شوخی! ایک ایسے پرانے گنہگار کے کیرکٹر کی تصویر کھینچی ہے جو اب تائب ہو چکا ہے لیکن نظر بازی کی پرانی عادت بالکل بھول نہ سکی۔

شعر میں خاص بات یہ ہے کہ اسے سنکر انتقال ذہن عشق شہوانیہ کی طرف نہیں ہوتا بلکہ رسائی خیال صرف حسن پرستی تک محدود رہتی ہے۔

(۵) بھاتی ہے مجھے اک طلب بوسہ میں یہ آن
لکنت سے الجھ جائے اسے بات نہ آئے

اس شعر میں بھی طلب بوسہ کو نمایاں نہیں کیا ہے بلکہ جو صورت خصوصیت سے پیش نظر ہوتی ہے وہ معشوق کا بھولاپن ہے۔ جو لطف شہوانی سے بہت بلند ہے۔

پانچواں اصول	غزل میں کسی بادشاہ یا صاحب دولت کی تعریف نہ ہونا چاہئے کیونکہ ایسے خیال بالعموم آوردہ ہوتے ہیں جن کو شعریت اور

خصوصاً غزل سے کوئی تعلق نہیں۔

میر صاحب اس اصول کے لئے فرماتے ہیں ؎

مجھ کو دماغ وصف گل و یاسمن کہاں
میں جوں نسیم باد فروش چمن نہیں

چھٹا اصول | "چونکہ غزل کی بنیاد حسن و عشق پہ قائم ہے لہذا غزل میں صرف داخلی شاعری ہونا چاہیئے"

اس اصول کی روشنی میں اگر کلام میسؔر پر نظر ڈالی جائے تو علاوہ اون رطب و یابس کے جو محض ان کے دیوان کی ضخامت بڑھا رہا ہے۔ ان کی تمام غزلیں خالص داخلی رنگ میں ملیں گی۔ مثال کے طور پہ میسؔر صاحب کے مختلف اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

میر صاحب کے کلام پر اگر ناقدانہ نظر ڈالی جائے تو سب سے زیادہ نمایاں طریقہ پہ ان کا وہ شاعرانہ آرٹ سامنے آتا ہے جس میں انہوں نے مختلف جذبات، کیفیات اور مناظر کی تصویر کشی کی ہے۔

شوق اور حقیقی شوق قابل اخفا چیز نہیں۔ انسان قوت ضبط کو ہزار کام میں لائے لیکن جذبات دلی کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ضرور ہو جاتے ہیں۔ اسی خیال کو میسؔر صاحب اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

ہر چند میں نے شوق کو پنہاں کیا ولے
ایک آدہ حرف پیار کا منہہ سے نکل گیا

ایک تو ضبط شوق یوں ہی مشکل کام ہے پھر ستم یہ کہ محبوب نگاہوں کے سامنے۔ لہذا ایسی حالت میں کون کافر ضبط کر سکتا ہے لیکن میر صاحب اپنے اس خیال کو اون لوگوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ جو عاشق کو اخفائے شوق کی صلاح دیا کرتے ہیں۔ لہذا اظہار مطلب میں چارہ سازوں کے جذبات کا پورا خیال کیا ہے۔

پہلے مصرعہ میں "ہر چند" کے ٹکڑے سے اپنی انتہائی مجبوری اور کوششوں میں ناکامی دکھا دی ہے۔ پھر "ایک آدہ حرف" سے بیتابی شوق اور قوت ضبط کی کشمکش کی مکمل تصویر کھینچی ہے۔ جس میں چارہ سازوں کی خاطر سے بیتابی شوق کا معمولی سا غلبہ دکھا دیا ہے۔ دیوانگی عشق کا تماشا دیکھیے ؎

طرفہ خیال کیا کرتا تھا عشق و جنون میں روز و شب
روتے روتے ہنسنے لگا ہیتیم عجب دیوانہ تھا

خواجہ نصیر الدین نے بھی اِس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے:

گہہ خندم گہہ گریان چوں طفل بخواب اندر

لیکن ہیتی صاحب دیوانہ بنکر ہوشیاری کر گئے اور "طفل بخواب اندر" سے بہت بڑھ گئے۔ پھر طرفہ خیالی عشق و جنون نے تو شعر کو ہر پہلو سے مضبوط بنا دیا ہے۔

اپنی دیوانگی عشق کی ایک اور تصویر

گہہ آپ میں نہیں ہو گہہ منتظر کہیں ہو
ہیتی تجی تمہارا ان روز وں حال کیا ہے

آمد بہار کی تصویر

بہار آئی ہے غنچے گل کے نکلے ہیں گلابی سے
نہال سبز جھومتے ہیں گلستانیں شرابی سے

ہندو بیوٹی

صبح چمن کا جلوہ ہندی نینوں میں دیکھا
صندل بھری جبیں پی ہونٹوں نیہ لالیاں ہیں

محفل میں محبوب کی موجودگی اور عاشق کے سچے جذبات

بزم میں منہہ ادھر کریں کیونکہ اور نیچی نظر کریں کیوں کر !
یوں بھی مشکل ہے دوں بھی مشکل ہے سر جھکائے گذر کریں کیوں کر !

بہاری جی نے بھی یہی مضمون اس طرح کہا ہے

इन दुखिया अँखियान कौ सुख सिरजोई नाहिं ।
देखत बनै न देखते बिन देखे अकुलाहिं ॥

ترجمہ۔ ان غریب آنکھوں کو کسی طرح چین نہیں (محبوب کو) اگر دیکھتی ہیں دیکھا نہیں جاتا۔ اور اگر نہیں دیکھتیں تو بے چین ہوتی ہیں۔

چشم شرگین کی وضع پرستی اور عاشق کی آرزومندی سے

بڑہتی نہیں اوہر کو تا بسم تلک بہی پہو نچیں!
پہرتی ہیں وہ نگاہیں پلکوں کے سائے سائے

خواب ناز سے فوراً بیداری کے بعد محبوب کی تصویر سے

نظر اوٹہتی نہیں کہ جب خوباں
اوٹہ کے سوتے سے آنکھ ملتے ہیں

دوسری چیز میر صاحب کے یہاں اون کی جدت طرازی اور رفعت تخیل ہے جسکو بعد میں ایک معتقد کی حیثیت سے غالب نے اپنی شاعری کی خصوصیت قرار دے لیا۔ چند شعر سن لیجئے۔ اپنی ناتوانی کو کیسے نئے طریقے پر پیش کیا ہے سے

زیر شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا
سر بہی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

شعرا نے طرح طرح سے عاشق کی ناتوانی کا ذکر کیا ہے لیکن میر صاحب کا خیال اون سب سے الگ ہے۔ آئین عشق میں عاشق کا سب سے بڑا فرض تسلیم محبت ہے۔ میر صاحب کہتے ہیں کہ ہائے ناتوانی کا کیا حال پوچھتے ہو۔ شمشیر قاتل کے نیچے تڑپنا تو بہت بڑی بات ہے۔ یہاں تو ضعف کی وجہ سے دم آخر تسلیم محبت کے لئے سر بہی تو نہ ہل سکا حالانکہ یہ اوسی عشق کا ایک ضروری کام تہا جس کے لئے میں نے جان دی ہے"۔

عشق کا کام صرف ہو "حق" نہیں بلکہ اس سے عاشق کے تمام اخلاقی عیوب دفعہ ہو جاتے ہیں جیسا کہ مولانا روم کہتے ہیں سے

شاد باش اے عشق اے سودائے ما ‏ ‏ اے طبیب جملہ علت ہائے ما!

ایک عاشق کامل جو اخلاق مجسم ہے اپنے دشمنوں کی تکلیف گوارا نہیں کرتا۔ اسی خیال کو پیش نظر رکھکر میر صاحب کہتے ہیں ؎

کس طرح راہ عشق چلوں ہے یہ ڈر مجھے
پھوٹیں کہیں نہ آبلے ٹوٹیں کہیں نہ خار

ایک رہ نورد راہ عشق کے سب سے بڑے دشمن جو ہوسکتے ہیں وہ اوس کے پاؤں کے آبلے اور راہ کے کانٹے ہیں جو قدم قدم پر مانع رہنوردی ہوتے ہیں لیکن ایک عاشق کامل ہونیکی حیثیت سے اون کی بھی تکلیف کا میر صاحب کو پورا خیال ہے۔
میر صاحب معشوق کے معاملے میں خدا پر بھی اعتبار نہیں کرتے ؎

عشق اون کو ہے جو یار کو اپنے دم رفتن ا
کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

اسی تخیل کو ایک دوسری صورت میں غالب نے بھی کہا ہے ؎

قیامت ہے کہ ہوئے مدعی کے ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

محبوب کی اذیت کا لحاظ کس خوبصورت انداز سے کیا ہے ؎

جم گیا تھا کف قاتل پہ تیرا خون نہ بس
اون نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

عاشق اپنے قتل ہونے کو مطلق اہمیت نہیں دیتا بلکہ ملال اس بات کا کرتا ہے کہ میرے ذبح کرنے میں قاتل کے ہاتھ اس طرح خون آلود ہوگئے کہ اوسے اونکو دھونے میں زحمت ہوئی۔
اس شعر کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قدرت نے میرے ذبح ہونے پر قاتل کے رونیکا سامان اس طرح کیا کہ اوس کے ہاتھ بری طرح خون آلود کردئے جنکے دھونے میں

اذیت کے بہانے اوسے رونا پڑا۔
حقیقی عاشق کی زندگی محبوب کے چہرے کے تغیرات سے منعکس رہتی ہے۔ جو تغیر محبوب کے چہرے پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کا اثر عشق کے سبب (recall) عاشق کے چہرے پر کتنی جلد ظاہر کر دیتے ہیں ؎

دل کی شکستگی نے ڈرا دیئے رکھا ہمیں!
واں چیں جبیں پہ آئی یہاں رنگ رو تہا

براؤنی (Browning) جنت کو باعث فخر سمجھتے ہوئے کہتا ہے کہ

THOU HEAVEN'S CONSUMNATE CUP,
WHAT NEEDEST THOU WITH EARTH WHEEL

ترجمہ تو جنت کا مکمل پیالہ ہے۔ تجھے گردش عالم سے کیا سروکار ہے۔
لیکن میر صاحب زمرہ عشاق میں جنت کا ذکر بھی باعث ننگ اور تنگ ظرفی سمجھتے ہیں۔

اوس ستمگار کے کوچے کے ہوا خواہ ہیں
نام فردوس کا ہم لے کے گنہ گار ہوئے

تصور ایک نہایت اہم چیز ہے اس کی بدولت ایک جذبہ شوق کو اتنا قوی کر سکتی ہو کہ اس پر قابو پانا انسانی امکان سے باہر ہو جائے۔ اس خیال کو میر صاحب یوں پیش کرتے ہیں ؎

یاد اوس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ دل سے بھلایا نہ جائے گا!

ہائے کیا تخیل ہے ؎

کس گنہ کا ہے پس از مرگ یہ عذر جا نشوند
پاؤں پر شمع کے پاتے ہیں سر پروانہ!

عشق کی گفتگو طولانی داستان کتنے اختصار سے پیش کی ہے ؂

کیا نہیں کچھ کہا نہیں جاتا
اور چپ بھی رہا نہیں جاتا

انقلاب زمانہ سے اجڑے ہوئے میخانہ کی حالت ؂

قطعہ

شب اس دل گرفتہ کو وا کر بزور مے — بیٹھے تھے شیرہ خانے میں ہم کچھ بزرہ کوش
آئی صدا کہ یاد کرو دور رفتہ کو — عبرت بھی ہے ضرور ذرا اے جمع تیز ہوش
جمشید جس نے وضع کیا جام کیا ہوا ! — دے صحبتیں کہاں گئیں کیدہر وہ نا و نوش
جز لالہ اوسے جام کا پاتے نہیں نشان — ہے کوکنار اس کی جگہ اب سبو بدوش
چھوڑے ہے بید جائے جوانان میگسار — بالائے خم ہے خشت سر سر مے فروش

درس عبرت دینے والا ایک مکمل اور اچھوتا تخیل ؂

یہ جاں تو کہ ہے اک آوارہ دست بردل
خاک چمن کے اوپر برگ خزاں جہاں ہو

خاکدان عالم کی واقعی حالت شاعرانہ لہجے میں ؂

رہ غباری جہان سے نہیں سدہ میسر ہمیں
گرد اتنی ہے کہ مٹی میں دبے جاتے ہیں !

اہل دنیا کی حالت کی ایک مکمل تشبیہ ؂

عالم کے لوگوں کا ہے تصویر کا سا عالم !
ظاہر کھلی ہیں آنکھیں لیکن ہیں بے خبر سب

بےشعوری کو بھی ایک نعمت ٹھیرا دیا ہے ؎

صد رنگ بحث رہتی ہے یاں بےشعور سے
اے وائے عقلمند کہ ناداں ہوا نہ تو! میر

ایک ایسا تخیل جس کی شرح تو ہو نہیں سکتی ہاں روح لطف حاصل کر سکتی ہے ؎

ہائے اوس زخمی شمشیر محبت کا جگر
درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو میر

دور جدید کے روشن خیالوں نے گو تصوف کو ایک حماقت تصور کر لیا ہے لیکن پھر بھی ایک آزاد خیال سے آزاد خیال فلسفی اوس کے شاعرانہ لطف سے انکار نہیں کر سکتا۔

ایک فطری شاعر جس میں ذرا بھی فلسفہ کا مذاق موجود ہوگا اپنے کلام کے کسی نہ کسی شعبہ میں تصوف پر روشنی ضرور ڈالے گا۔ چنانچہ یہی صورت میر صاحب کی بھی ہے۔ آپ نے بھی اپنے کلام کا کچھ حصہ نذر تصوف کیا ہے جس میں سے چند شعر درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

پروانہ شمع پر اس لیے نہیں گرتا کہ اوس کی چمک اوسے بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ اوس کی گرویدگی کا خاص سبب یہ ہے کہ وہ شمع کے مشتعل شعلوں میں نور حقیقت کی جھلک دیکھتا ہے پھر بھلا جب نور حقیقت بالاصل رونق دہ بزم عالم ہو جائے تو پھر پروانہ کو شمع کی روشنی کیونکر بھلی معلوم ہو سکتی ہے۔ بلکہ اوس صورت میں تو شمع کی روشنی پروانہ کے لیے ہیچ نظر ہوگی اسی خیال کو میر صاحب یوں ادا کرتے ہیں ؎

شب فروغ بزم کا باعث ہوا تھا حسن دوست
شمع کا جلوہ غبار دیدۂ پروانہ تھا!

گیتا اور ویدوں کا یہی اپدیش ہے کہ انسان کو بندہ کرنے والی صرف خواہشات ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو انسان خدا ہے۔ اسی نظریے کو میر صاحب یوں بیان کرتے ہیں ؎

سراپا آرزو ہونے نے مجھکو کر دیا بندہ
وگرنہ ہم خدا تھا اگر دل بے مدعا ہوتا

خدا! جس کی جستجو میں فلاسفہ کے دماغ ہزاروں برس سے لگے ہوئے ہیں دراصل نفس انسانی یا (self) ہی ہے جیسا کہ ماہر فلسفہ الہیات حضرت علیؑ کی حدیث ہے ۔

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ ۔

میر صاحب اس خیال کی ترجمانی یوں فرماتے ہیں ؎

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا
نہ سمجھا ہم کہ اس قالب میں تو تھا

یہی خیال کبیر جی اس طرح نظم کرتے ہیں ؎

आँखों बीच नजारा साधो, आँखों बीच नजारा है।
सत गुरु ने मुझे बतलाया, तुझ में तेरा प्यारा है॥

ترجمہ ۔ اے سادھو دیکھ وہ نگاہوں میں سمایا ہوا ہے ۔ رہبر کامل نے یہ راز مجھے بتا دیا کہ تیرا پیارا (خدا) تجھ میں ہے ۔

قریب قریب یہی خیال ٹینسن نے بھی کہا ہے ؎

we feel we are nothing - for all is thou and in thee

ترجمہ ۔ ہمیں احساس ہے کہ ہم کچھ نہیں جو کچھ ہے وہ تو ہے اور تجھ میں ہے ۔

ایک دوسرے طریقے پر میر صاحب نے اس مضمون کو پھر نظم کیا ہے ؎

کب سے نظر لگی تھی دروازۂ حرم سے
پردہ اٹھا تو لڑیاں آنکھیں ہماری ہم سے

ذات احدیت سے باخبری بھی بے خبر کر دیتی ہے ؎

تیری آہ کس سے خبر پائیے ۔ وہی بے خبر ہے جو آگاہ ہے ۔ میر

یہی شیخ سعدی کا بھی مقولہ ہے ؎

این مدعیان در طلبش بے خبر آنند
کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

کسی ہندی شاعر نے بھی یہی بات کہی ہے ؎

हुस्न नगर महबूब का जहाँ न जाय कोई ।
जाय तो जिये नहीं जिये तो बौरा होय ॥

ہمہ اوست کا مسلک ؎

گوش کو ہوش کے ٹک کھول کے سن شور جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک — میرؔ

ٹینیسن نے بھی یہی خیال اس طرح کہا ہے ؎

How would'st thou glory in all the splendours
& voices of the world -

ترجمہ - تو دنیا کی دلکشی اور شور و غوغے میں کتنا روشن ہوگا۔

مالے کی جاپ اور ظاہری عبادت کا تمام دنیا میں رواج ہے - جو عبادت کے حقیقی راز سے واقف ہو جاتے ہیں وہ تسبیحوں کو توڑ کر پھینک دیتے ہیں اور مالاؤں کو جلا ڈالتے ہیں ؎

تسبیحیں توڑیں خرقے مصلے پھاڑ چلے
کیا جانے میرؔ کیا کہہ گئے کیا تھا خانقاہ میں — میرؔ

کچھ اور تصوف کے بہترین شعر ؎

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں — اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں
عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا — اس مشت خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں — میرؔ

صورت پذیر ہم ہیں یا ہرگز نہیں وہ معنی ۔۔ اہلِ نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں
اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے ۔۔ اس راز کو ولیکن معدود جانتے ہیں — میر

ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

میر

آنکھیں جو ہوں تو عین ہے مقصود ہر جگہ ۔۔ بالذات ہے جہاں میں وہ موجود ہر جگہ!
واقف ہو شانِ بندگی سے قید و بند کیا ۔۔ سر ہے کہیں جھکا ہے مسجود ہر جگہ

علاوہ تصوف کے میر صاحب نے جنرل فلاسفی پر بھی روشنی ڈالی ہے کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔
موت کے لئے بیکن کہتا ہے۔

Pompa mortis magis terret quam mors ipsa

ترجمہ موت دشوار نہیں موت سے زیادہ کوئی سہل چیز نہیں۔
میر صاحب بھی موت کو ایک پر لذت چیز بتاتے ہیں ؎

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا — میر

کس قدر توضیح سے ٹینی سن اس خیال کو اس طرح پیش کرتا ہے ؎

Beautiful was death in him, who saw the death but kept the deck,
Saving women & their babies & sinking with the sinking wreck,
Gone for ever! Ever? no — for since our dying race began,
Ever, ever, & for ever was the leading light of man.

کبیر جی بھی لطف مرگ کے معترف ہیں۔

कबीर मरने से जग डरे मेरे मन आनन्द।
मरने ही से पाइये पूर्णपरम आनन्द ॥

ترجمہ۔ کبیر! مرنے سے دنیا ڈرتی ہے۔ مگر مرنے میں بڑا مزا ہے۔ اس سے وہ لطف پوری طرح حاصل ہوتا ہے جو ہر لطف سے بلند ہے۔

جبر و اختیار کا مسئلہ:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
میر

حکیم سوفسطائی اور ہر کلھے موجودات کو اوہام کا طلسم سمجھتے ہیں۔ ویدانت میں بھی مایا اور دنیا کا فلسفہ بھی بیان ہوا ہے۔ اس مسئلہ کو میر صاحب نے اس طرح کہا ہے۔

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا!!

فلسفی مارٹینو (Martineau) نے اپنی کتاب "ٹائپ آف ایتھکل تھیوری" میں کانشنس پر جو طولانی بحث کی ہے اوس کا ماحصل میر صاحب صرف دو مصرعوں میں اس طرح بیان کر دیتے ہیں:

ہمارا خاص مشرب عشق جس میں
پیمبر دل ہے، قبلہ دل، خدا دل
میر

حیات جاویدہ کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں:

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر!
میر

تیسری چیز میر صاحب کے کلام میں اون کے جذبات کے سادے سادے شعر ہیں

جن میں جادو بھرا ہوا ہے۔ کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔۔

کچھ کرو فکر مجھ [illegible] کی — دھوم ہے پھر بہار آنے کی
میری تقصیر جا بر سے ہم جا — اتفاقات ہیں زمانے کے

قصر و [illegible] منزل ایکوں تو سب جگہ ہے
ایکدن گر جا نہیں ہے دنیا عجب جگہ ہے

گو تو جہ سے زمانہ کی جہاں میں ہم کو — جاہ و ثروت کا میسر کوئی ساماں نہ ہوا
شکر صد شکر مگر ذلت و خواری کے سبب — کسی عنوان سے ہم چشم عزیزاں نہ ہوا

چوتھی چیز میر صاحب کے وہ نشتر ہیں جن کی تعداد اون کے دیوان میں بہتّر بتائی جاتی ہیں۔ ان اشعار میں خاص بات یہ ہے کہ ان کے لہجے میں عمق ہے نہ الفاظ میں گہرائی۔ مگر مطلب کچھ اس انداز سے ادا کیا گیا ہے کہ شعر واقعی نشتر کی طرح دل میں پیر جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ؎

ہوا ہے اب تو یہ عالم ترے بیمار ہجراں کا
کہ جس نے کھول کر منہ اوسکا دیکھا بس وہیں [illegible]

کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے — چاک قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا
دور بیٹھے نے ہم سے رقت نہیں! — پوچھ کچھ حال بیٹھ کر نزدیک

مرتے ہیں میر سب پہ نہ اس بیکسی کیساتھ
ماتم میں تیرے کوئی نہ رویا پکار کے!

میر صاحب کی غزلوں کے اس سرسری مطالعہ سے ہر شخص ان کی عظمت کا اندازہ کرسکتا ہے۔ اب میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ایک غزل گو کی حیثیت سے اونکا پوزیشن اون کے ہمعصر شعرا میں کیا تھا؟ ۔

میر صاحب اور اون کے ہم عصر شعراء

صاحب کے [illegible] سے شعرا تھے مگر ان [illegible] سے صرف دو مرزا سودا اور خواجہ میر درد ایسے ہیں جو اس عہد میں بھی قریب قریب میر صاحب کے ہم مرتبہ سمجھے جاتے تھے۔

میں اس خیال سے تو اتفاق کر نہیں سکتا کہ مرزا صاحب یا خواجہ صاحب بحیثیت میر صاحب کے ہم مرتبہ تھے۔ لیکن ہاں ان دونوں بزرگوں میں بعض خصوصیات شاعرانہ ضرور ایسی ہیں جن کی وجہ سے ان کا ذکر میر صاحب کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

جہاں تک صنف غزل کا تعلق ہے اس بات پر تمام اہل الرائے متفق ہیں کہ میر صاحب بے عدیل تھے۔ تاثر جو جان غزلیت ہے میر صاحب کے یہاں اتنا زیادہ ہے جس کا جواب سودا کے یہاں شاذ اور درد کے یہاں مقابلتہً کم ملے گا۔

سب سے پہلے اگر میر صاحب اور سودا کی غزلوں کا بالمقابل مطالعہ کیا جائے تو انہیں ایک خاص فرق نظر آئے گا۔ اور وہ فرق یہ ہے کہ میر صاحب کے یہاں فطریت، محزونیت واردات قلبی اور دیگر وجدانی کیفیات کا جلوہ نظر آئے گا۔ لیکن اس کے برخلاف سودا کے یہاں جبروت، شوکت الفاظ، تصنع اور دیگر دماغی قوتوں کا تماشہ دکھائی دے گا۔

وہی بات جسے میر صاحب نہایت سکنت کے ساتھ نرم سے نرم لہجے میں بیان کریں گے سودا پر شوکت سے پرشوکت لہجے میں پیش کریں گے۔

گویا مختصر الفاظ میں میر صاحب اور سودا کی شاعری میں فرق اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ میر صاحب کی شاعری بالقلب اور سودا کی شاعری بالدماغ ہوتی تھی۔

جو اصل سودا مشرقی شاعری کے اصول سے ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے لیکن اون کے دماغ کو قدرت نے صرف قصیدہ گوئی کی تکمیل کے لئے پیدا کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ

وہ اپنی غزلوں میں بھی شان قصیدہ گوئی کو فراموش نہ کر سکے۔ اگر نازک عشقیہ مضمون کبھی اُنکے سامنے آتے تھے تو قصیدے کے لہجے میں ڈھلکر اون کی شان وہی ہو جاتی تھی جو ایک تشبیب قصیدہ کی ہوا کرتی ہے۔

نمونتاً دو چار شعر دونوں استادوں کے درج کئے جاتے ہیں ؎

سودا کے جو بالیں پہ ہوا شور قیامت
خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے ! — سودا

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے — میر

سودا کے شعر میں جو دبدبہ ہے وہ بظاہر بڑا دلکش معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کہاں عاشق کی بے سر و سامانی اور کہاں خدام ادب کا پہرا۔ غالب تو کہتے ہیں ؎

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

عاشق کے لئے ہر صورت میں بے سر و سامانی ہی درکار ہے۔ اوس کی زندگی اگر مصائب سے پر ہو تو مرنے کے بعد قبر پر وحشت، دیوانگی، غربت اور کس مپرسی ہونا چاہئے۔ لیکن سودا کے شعر میں یہ بات نہیں جس کی وجہ سے اون کے عشق کا درجہ کسی قدر پست ہو گیا ہے۔ ہاں میر کا شعر البتہ اس بلند نظریئے سے مطابق ہے۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ میر کا ایسے شعر کو ترجیح حاصل ہے۔ اس کے علاوہ غزل میں جس زبان کی ضرورت ہے وہ بھی میر کے شعر میں ہے۔

سودا ؎

آنکھوں میں اگر تیری بیوفائی کا ! لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا !

گلا میں جس سے کروں تیری بیوفائی کا
جہاں میں نام نہ لے پھر وہ آشنائی کا — میر

"لہو میں آشنائی کا سفینہ غرق ہونا" ایک عمدہ خیال ہے لیکن اس میں تصنع کی اچھی خاصی جھلک آ گئی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شعر ایک حد تک دماغی ہو گیا ہے۔ لیکن میر صاحب کے شعر کا تاثر صاف بتا رہا ہے کہ اون کا شعر خالص واردات قلبی ہے۔ میرے خیال میں کوئی شخص غزل میں واردات قلبی پر دماغی اشعار کو کسی طرح ترجیح نہیں دے سکتا۔ اس کے علاوہ میر صاحب کا "گلہ بیوفائی کرنا" سودا کے گلہ بیوفائی لکھنے سے زیادہ فطری اور مانوس ہے۔

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
اب آئی سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی ؛ سودا

رات ساری تو کٹی سنتے پریشاں گوئی
میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو میر

سودا کا شعر گو نہایت بلند اور لطیف ہے مگر میر صاحب کی سادگی، روانی اور نرمی نے ان کے شعر کو زیادہ ممتاز بنا دیا ہے۔

اب خواجہ میر درد اور میر صاحب کا تقابلی مطالعہ کیجئے۔

خواجہ صاحب اور میر صاحب کا ذکر ایک ساتھ کرتے ہوئے مشہور فرانسیسی مقالہ نگار مسٹر گارکن ڈی تاسی (M.R.GARCIN-DE-TASSY) کا حیرت انگیز نتائج کسی طرح سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

موصوف کا ارشاد ہے کہ "میر صاحب خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ یہ تعجب خیز خیال موصوف کی شان تحقیق پر بہت بڑا حرف آتا ہے۔ غالباً میر صاحب نے اپنے تذکرہ "نکات الشعرا" میں خواجہ صاحب کے لئے جو شاندار الفاظ استعمال کئے ہیں۔ وہی اس غلط خیال کی طرف مسٹر گارکن کا انتقال ذہن کرنے کے موجب ہوئے ہیں کیونکہ یہ ایک ایسی انوکھی بات ہے جسے آج تک کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا ہے۔

اپنے تذکرہ میں میر صاحب نے خواجہ صاحب کیلئے جو کچھ لکھا ہے اوس کی بنا پر

محض اس اخلاص پر ہے جو میر صاحب کو خواجہ صاحب کی بزرگ خصلتی اور فقر کی وجہ سے اون سے تھا۔ استادی اور شاگردی کا خیال بالکل مہمل ہے۔

بحیثیت شاعر خواجہ صاحب میں البتہ وہ تمام کیفیات موجود تھیں جو ایک اعلیٰ درجہ کے غزل گو میں ہونا چاہیئے۔ مگر پھر بھی میر صاحب سے کم تھیں۔ ذیل میں کچھ شعر دونوں بزرگوں کے درج کیئے جاتے ہیں ؎

حیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراج خزاں
آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا — درد

یک نگاہ آشنا کو بھی وفا کرتا نہیں
وا ہوئیں مژگاں کہ سبزہ سبزۂ بیگانہ تھا — میر

خواجہ صاحب کا تخیل صرف اس قدر ہے کہ انہوں نے چمن میں اپنی حقارت دکھاتے ہوئے سبزۂ بیگانہ سے دوستی کا اظہار فرمایا ہے اور اس کی تاراجی پر آنسو بہائے ہیں۔ لیکن میر صاحب نے کچھ جادو بھرے الفاظ میں بے ثباتی دنیا کا نقشہ کھینچتے ہوئے سبزہ بیگانہ کی معنویت سے فائدہ اٹھا کر مصرع کتنے بلیغ اور موثر انداز سے لگایا ہے۔ گو خواجہ صاحب کا شعر دنیائے غزل کا ایک زبردست کارنامہ ہے مگر اس پر بھی میر صاحب آگے بڑھ گئے ہیں۔

بہ چلا دل ہو کے آنکھوں سے گداز
منھ پہ آکر جسم رہے تو جم رہے — درد

دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک
قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا — میر

خواجہ صاحب گرمی عشق سے دل کو گداز کرکے منھ تک ایک غیر متعین صورت میں لائے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ "یہ سیال دل شاید منھ پر جم جائے" لیکن میر صاحب نے دل کی کم مائیگی کی ایک انتہائی حد دکھا دی ہے اور کہا ہے کہ "میرا کم مایہ دل آنکھوں سے خون ہو کر بہا

لیکن اپنی بے بضاعتی کی وجہ سے وامن تک بھی نہ پہونچ سکا بلکہ پلکو ں ہی پہ تھم کر رہ گیا"
ظاہر ہے کہ میر صاحب کا تخیل خواجہ صاحب سے کہیں زیادہ بلند ہے ۔
رکھہ نقحت فیلہ من الکم وقمی" کو یاد

درد — درد جب تک تیرے دم میں دم رہے

میر — غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا!

دونوں استادوں نے دم کے قافیہ پر زور طبیعت دکھایا ہے۔ تخیل اور ردیف بالکل مختلف ہیں۔ صرف شعریت سے میر صاحب کی افضلیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔
بہرحال، اس مختصر بحث کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ میر صاحب اپنے عہد میں بہترین غزل گو تھے۔

انتخاب غزلیات میر

اس بحث کے بعد میں غزلیات میر کا ایک مختصر سا انتخاب بھی پیش کیے دیتا ہوں۔ جو اشعار درج ذیل کیے جاتے ہیں وہ محض میرا انتخاب نہیں بلکہ مختلف بامذاق لوگ انہیں منتخب کر چکے ہیں۔ علی الخصوص ان کا زیادہ حصہ حضرات اثر لکھنوی کا انتخاب ہے جن کے ذوق سلیم پر مجھے پورا اعتماد ہے۔
میں محض اپنا انتخاب اس وجہ سے نہیں درج کرتا تاکہ ان اشعار کی دلچسپی محض میرے ہم مذاق حضرات تک محدود نہ ہو جائے۔
اپنے انتخاب میں میں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ وہ شعر نہ پیش کیے جائیں جو زبان زد خلائق ہو چکے ہیں۔ بلکہ کچھ نئی چیزوں سے ناظرین کی ضیافت طبع کی جائے۔

انتخاب غزلیات میرؔ

بلبلوں نے کیا گل افشاں میرؔ کا مرقد کیا
دور سے آیا نظر تو پھولوں کا اک ڈھیر تھا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا!
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

دم صبح بزم خوش جہاں شب غم سے کم نہ تھی مہربان
کہ چراغ تھا کسو تو دود تھا جو پتنگ تھا سو غبار تھا

کس شام سے اوٹھا تھا مرے دل میں درد سا
سحر ہو چلا ہوں بیشتر از صبح زرد سا!

پایا نہ یوں کہ کرتے اوس کی طرف اشارہ
یوں تو یہاں میں ہم نے اوسکو کہاں نہ پایا

ہیں رہتے عاقل علاقے بعید
کہیں تیر و بولنے دل کو لگا!

اس موج خیز دہر میں تو ہے حباب سا
آنکھیں کھلیں تری تو یہ عالم ہے خواب سا

اگتے تھے دست و بلبل و دامان گل بہم
صحن چمن نمونۂ یوم حساب تھا

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا!

کس طرح سے مانئے یارو کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اڑا جاتا ہے ٹک دیکھو تو چہرہ میرؔ کا

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہب عشق اختیار کیا!

راہ دور عشق میں روتا ہے کیا؟
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

گیا حسن خوبان بد راہ کا
ہمیشہ رہے نام اللہ کا

بیخودی لے گئی کہاں ہمکو
دہر سے انتہا رہے اپنا

یہ دو ہی صورتیں ہیں یا منعکس ہے عالم!
یا عالم آئینہ ہے اوس یار خود نما کا

کیا شوق کی باتوں کی تحریر ہوئی مشکل
تھے جیج قلم کاغذ پہ کچھ نہ لکھا جاتا

پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے
نظر میں سبھوں کی خدا کر دیا

غیرت یوسف ہے یہ وقت عزیز
میر اسکو رائیگاں کھوتا ہے کیا

کیا مرے آنے پہ تو اے بت مغرور ہو گیا
کبھی اس راہ سے نکلا تو مجھے گھور گیا

آئے برنگ ابر عرق ناک تم ادہر
حیران ہوں کہ آج کدہر کو کرم ہوا

دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم!
یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا!

بزم عشرت میں ملامت ہم نگوں بختوں کے تئیں
جوں حباب بادہ ساغر سرنگوں ہو جائیگا

سرسبز ہیں سے لیکن وہ بیر کار
دیکھو تو ہم سر بان ہے گویا

آنکھیں پڑتی تھیں تمہاری منہ پہ جبتک چین تھا
کیا کیا تم نے کہ مجھ بیتاب سے پردہ کیا

ہم نہ کہتے تھے کہیں زلف کہیں رخ نہ دیکھا
اختلاف آیا نہ ہندو و مسلمان کے بیچ

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتا ہے ہر دیواروں کے بیچ

جاتا ہے آسمان لئے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھر ادر و دیوار دیکھکر

شوخی تو دیکھو آپ ہی کہا آؤ بیٹھو میر
پوچھا کہاں؟ تو بولے کہ میری زبان پر!

میر صاحب ہی چوکے اے بد عہد
ورنہ دینا تھا دل قسم لے کر

ظاہر پرست ہوتے ہیں کب معنی آشنا
ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

نہ ملیں گو کہ ہجر میں مر جائیں
عاشقوں کا وصال ہے کچھ اور

میر تلوار چلتی ہے تو چلے!
خوش خراموں کی چال ہے کچھ اور

کر سیر جذب الفت گلچیں نے کل چمن میں
توڑا تھا شاخ گل کو نکلی صدائے بلبل

فقیر ہونے نے سب اعتبار کھویا ہے
قسم جو کھاؤں تو کہتے ہیں کیا گدا کی قسم

خاک ہے اصل طینت آدم اسکو چاہئے عجز اکرے
بات کی تہہ کو پا جاتے تو اتنا سر نہ اٹھاتے ہم

۱۸۴۴۷

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں!

مارا مجھے بھی سان کے غیروں میں ان نے میر
کیا خاک میں ملائیں میری جاں فشانیاں

گوندھ کے گویا گل کی پتی وہ ترکیب بنائی ہے
رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں

یہ بھی سماں خوش ترکیبوں کا میر نہ اپنے جی سے گیا
سوتے سے اٹھ کر آنکھ ملیں ہیں لے انگڑائیاں جمائیاں

چلا نہ اٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر
ابھی تو اس کی گلی سے پکار لایا ہوں!

مری نمود نے مجھ کو کیا برابر خاک
میں نقش پا کی طرح پائمال اپنا ہوں

چلتے ہیں یہ تو ٹھوکر لگتی ہے میرے جی کو
چالیں بھی دلبروں کی سب سے نرالیاں ہیں

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ!
ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

پھرے رہتے ہیں سارے پھول ہی جس کے گریباں ہیں
وہ کیا جانے کہ ٹکڑے ہیں جگر کے میرے داماں ہیں

جی میں پھرتا ہے میر وہ میرے
جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں

جیسے بجلی کے چمکنے سے کسی کی سدھ جائے
بیخودی آئی اچانک ترے آ جانے میں

کوئی کانٹا سر رہ کا ہماری خاک پر بس ہے
گل و گلزار کی حاجت نہیں گور غریباں کو

یہ اضطراب دیکھ کہ سب دشمنوں سے بھی
کہتا ہوں اس کے ملنے کی کچھ تم دعا کرو!

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو
ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو

رہتے ہو تم آنکھوں میں پھرتے ہو تمہیں دل میں
مدت سے اگرچہ یاں آتے ہو نہ جاتے ہو

اب جان جسم خاک سے تنگ آ گئی بہت
کب تک اس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھوئیے

اس کا غضب سے نامہ نہ لکھنا تو سہل ہے
لوگوں کے پوچھنے کا کوئی کیا جواب دے

اوس کے ایفائے عہد تک نہ جیے
عمر نے ہم سے بیوفائی کی!

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پوچھو کوئی تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

کہلنا کم کم کلی نے سیکہا ہے اوس کی چیشموں کی نیم خوابی سے

صبح وہ آفت اٹہہ بیٹہا تہا تم نے نہ دیکہا صد افسوس
کیا کیا فتنے سر جوڑے پلکوں کے سائے سائے گئے

دکہاوے آنکہہ کبہو منہ پہ کبہولے زلف کبہو کبہو خرام [illegible] کے رستے بند کرے

لطف پر اوسکے ہم نشین مت جا کبہو ہم پہ بہی مہربانی تہی

اب تو ہم ہو چکتے ہیں ٹک تیرے ابرو خم ہوتے
کیا کیا رنج اوٹہاتے تہے جب جی میں طاقت رکہتے تہے

دم آخر ہی کیا نہ آنا تہا اور بہی وقت تہے بہانے کے

حال بد گفتنی نہیں میرا تم نے پوچہا تو مہربانی کی

عزت کی کوئی صورت دکہلائی نہیں دیتی چپ رہئے تو چشمک ہے کچہ کہئے تو گالی ہے

اب کر کے فراموش تو ناشاد کرو گے پہر ہم جو نہ ہونگے بہت یاد کرو گے

ستم ہے تیری خوئے خشمگیں پر ٹک بہی دل جوئی دل آزاری کی باتیں کر تو دلداری کو کیا جانے

اب ظلم ہے اس خاطر تا غیر بہلا مانے بس ہم نہ برا مانیں تو کون برا مانے

مصائب اور تہے پر دل کا جانا عجب کچہہ سانحہ سا ہو گیا ہے

تم جو دلجوئی خلق ہو ہم کو دشمنی ہے تمام عالم سے

روز اس [illegible] نہیں نسبت عشقی موقوف عمر بہر ایک ملاقات چلی جاتی ہے!

بہت نامہربان رہتا ہے یعنی ! ہمارے حال پر وہ مہربان ہے

آج پہر تہا بے جمعیت میں واں کل لڑائی سی لڑائی ہو چکی !

آج ہمیں بیتابی سی تہی صبر کی دل سے رخصت تہی چاروں اور نگہ کرنے میں عالم عالم حسرت تہی

جو لوگ آسمان نے یاں خاک کر اوڑائے !
بے عبرتوں نے لیکر خاک ان کی گہر بنائے

تو جہان کے بحر عمیق میں سر گرپیدہ اٹہ بلند کر — کہ یہ پنج روزہ جو بود ہے کبھی موج پر کا حباب ہے

دکہائی دئیوں کہ بے خود کیا — ہمیں آپ ہی سے جدا کرچلے

حدیث زلف دراز دوکس کے منہہ کی بات بڑی !

کبہو کے دن ہیں بڑے اور کبہو کی رات بڑی !

چشم دل کہول اس ہی عالم پر — یان کی اوقات خواب کی سی ہے

ولا بازی نہ کر ان گیسو ؤں سے — نہیں آسان کہلانا سانپ کا نے

جیسے شب آتش سا دیکہا دہکتے — اوسے پھر خاک ہی پایا سویرے

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن !

سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے !!

ـــــــــــــــ ـــــــــــ ـــــ
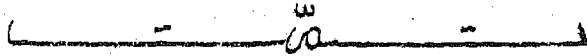
حصہ دوم

میر صاحب کی قصیدہ گوئی

قصیدہ قصد سے بنا ہے۔ چونکہ شاعر ایک قصیدہ کہنے سے قبل ہی کسی کی مدح[1] کا قصد کر لیتا ہے لہذا اُسے قصیدہ کہا جاتا ہے۔

قصیدہ گوئی اُردو اور فارسی[2] شاعری میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے لیکن میرے نزدیک اس کی رائجہ صورت پر نظر ڈالتے ہوئے اس کا زیادہ حصہ ایسا ہے جسے اعلیٰ قسم کی شاعری کہنا بہت بڑی غلطی ہے۔

میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ اعلیٰ شاعری صرف وجدانی شاعری کو کہا جا سکتا ہے جو قصیدے میں بہت کمیاب ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ صنف قصیدہ کے بنیادی اغراض و مقاصد ہی ایسے ہیں جنہیں وجدان سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی ظالم بادشاہ یا بدکردار صاحب دولت کی مدح سرائی دراصل شاعر کا کام نہیں۔ شاعر صرف اُن احساسات کا اظہار کرتا ہے جن سے خود اُس کا دل متاثر ہو رہا ہے۔ ضمیر کُشی اور شاعری بالکل متضاد چیزیں ہیں جن کا یکجا ہونا محال ہے۔

---

[1] مدح دراصل شامل قصیدہ نہیں ہونا چاہیے۔ اسے ہجو کی سرخی کے تحت میں سمجھنا چاہیے۔
[2] عربی قصائد کا اصول کسے مقدمہ مختلف ہے۔

البتہ چند باتیں قصیدہ میں ایسی ہیں جنہیں اعلیٰ شاعری کہا جا سکتا ہے۔

اول قصیدہ کی تشبیب جس میں شاعر کوئی بہاریہ، عشقیہ یا اخلاقی مسلسل مضمون بیان کرکے نفس موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ چونکہ تشبیب کسی صورت میں خلاف ضمیر نہیں ہو سکتی لہذا کم از کم قصیدے کے اس شعبے میں شاعر کو زور طبیعت دکھانیکا پورا موقع رہتا ہے۔

دوسرے قصیدے کے وہ مدحیہ اشعار جن میں شاعر کسی ایسی ہستی کی مدح کرتا ہے جو اوسکے خیال میں اس مدح کی سزاوار ہوتی ہے۔

چونکہ اس قسم کی مدح ہمیشہ بالاخلاص ہوتی ہے لہذا اوس میں شعریت کا وجود ہر وقت ممکن رہتا ہے۔ اس مداحی کو ہندی شاعری میں بھگتی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اسے بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

تیسرے۔ قصیدہ کا وہ جوش اور شکوہ جو ممدوح کی عظمت دکھانے کی ضرورت سے بہ تقلید قصائد عربی رنگ قصیدہ گوئی قرار دے لیا گیا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ ان تینوں چیزوں کو قصیدے کے غیر طبعی مبالغوں اور تصنع نے بہت کافی خراب کر دیا ہے۔ بہرحال قصیدے کا جتنا حصہ ان خرافات کی ضد سے بچ گیا ہے اوس میں اصل شاعری کی جھلک کبھی کبھی نظر آجاتی ہے۔

ایسی صورت میں میر صاحب جن کو فطرت نے خالص شاعر بنا کر بھیجا تھا صنف قصیدہ گوئی میں (جو حقیقی شاعری سے کسی قدر الگ شے ہے) کیونکر کامیاب ہو سکتے تھے۔ دوسرے اون کی بے نیازی، سیرچشمی، اور فقر پسندی نے بھی اونہیں اس صنف کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا۔ یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے وہ صنف قصیدہ میں نمایاں نہ ہو سکے لیکن تاہم بھی اون کے معدودے چند قصائد کے وہ مقامات جہاں قوت شعری دکھانے کا موقع تھا۔ اگر بغور دیکھے جائیں تو کسی قصیدہ گو سے کم نظر نہ آئیں گے۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ جوش و شکوہ جو لازمہ قصیدہ گوئی ہے میر صاحب میں انکے آلام کی وجہ سے نہیں رہا تہا۔ اسی وجہ سے وہ قصیدے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن یہ غلط ہے میر صاحب آلام میں ضرور مبتلا رہے لیکن اون کا نفس اتنا بلند تہا کہ وہ دنیاوی مصائب سے ذرا بہی متاثر نہ ہو سکا۔ لہذا یہ کہنا کہ اُن میں مصائب کی وجہ سے جوش یا شکوہ کا جذبہ نہیں رہا تہا۔ ٹہیک نہیں۔

میر صاحب کے قصائد میں بہی وہی جوش و شکوہ ہے جو کسی دوسرے عمدہ قصیدہ گو کے قصائد میں ہو سکتا ہے۔ بس میر صاحب نے صرف مندرجہ بالا سبب سے قصائد کم کہے ہیں ورنہ حقیقتاً وہ اس صنف میں بہی ماہر تہے۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انکے قصائد کا مرتبہ اون کی غزلیات سے مساوی نہیں جس کی ایک مزید وجہ خود صنف قصیدہ گوئی کا شاعرانہ نقص ہے۔

اردو کے بہترین قصیدہ گو مرزا سودا سمجہے جاتے ہیں۔ اگر ان کا اور میر صاحب کا بحیثیت قصیدہ گو مقابلہ کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ سودا کے قصائد زیادہ نمایاں ہیں جس کا خاص سبب یہ ہے کہ اس صنف میں زیادتی کلام کی وجہ سے ان کی مشق اتنی ہو گئی تہی کہ تصنعات شاعرانہ جو قصیدے کا خاص عنصر ہیں اون کے قبضہ میں آ گئے تہے۔ اگر بفرض میر صاحب بہی صرف قصیدہ گوئی پہ اپنے حقیقی جذبات شاعری کو قربان کر دیتے تو ممکن تہا کہ وہ سودا سے زیادہ قصیدے میں بہی کامیاب رہتے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ وجد کی دنیا میں رہنے والا تصنعات کی دنیا میں آتا ہی کیوں؟

واضح رہے کہ میں نے قصیدہ گوئی کی جو کچہہ مخالفت کی ہے اس کا دارومدار تمام تر جنرل شاعری کے اصول پر ہے۔ ورنہ میں مانتا ہوں کہ جہاں تک اردو اور فارسی شاعری کا تعلق ہے یہ صنف ایک نہایت وقیع صنف ہے جس میں بجز عالم شاعر کا گذر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جو تصنعات اور مبالغات قصائد میں ہوتے ہیں انکا پیدا کرنا ہر دماغ کیلئے ممکن نہیں۔

اب میں میر صاحب کے قصائد پر ایک سرسری نظر ڈال کر یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ بحیثیت قصیدہ گو وہ کس پائے کے شاعر تھے۔

میر صاحب کے قصائد جتنے مہیا ہو چکے ہیں اون کی تعداد اب تک سات[1] تک پہونچی ہے۔ پہلا قصیدہ حضرت علی علیہ السلام کی مدح میں ہے جس کے چار مطلع ہیں۔ مطلع اول یہ ہے ؎

جس دن سے خورشید ہوا ہے چمن افروز حمل
رنگ گل چمکے ہے ہر بات ہر کسی کے رو حمل

دوسرا قصیدہ بھی حضرت علی علیہ السلام کی مدح میں ہے۔ اس میں تین مطلع ہیں۔ پہلا مطلع یہ ہے ؎

اک شب کیا تھا یار تری زلف کا خیال
اتنے ہی دنوں میں مری میرا بال بال!

تیسرا قصیدہ بھی حضرت علی علیہ السلام کی مدح میں ہے۔ اور اس میں بھی تین مطلع ہیں مطلع اول یہ ہے ؎

غنچے ہو دل پہ آئے ہیں اندوہ اب مدام؛
پہونچے ہے مجھکو داغ گل جنگ صبح و شام؛

چوتھا قصیدہ جناب امام حسین علیہ السلام کی مدح میں ہے۔ اس میں دو مطلع ہیں۔ مطلع اول یہ ہے ؎

فلک کے جور و جفا نے کیا ہے مجھکو شکار
ہزار کوس پہ ہو جائے یک تپیدن وار

پانچواں قصیدہ شاہ عالم بادشاہ کی مدح میں ہے۔ اس میں چار مطلع ہیں۔

---

[1] بعض کلیات میں ۵ اور بعض میں ۶ بھی ہیں۔

ابتدائی مطلع یہ ہے ؎

جو ہوچکی قیامت تو آہ و فغان ہے
مرے ہاتھ میں دامن آسمان ہے

چھٹا قصیدہ خلد آشیان نواب آصف الدولہ بہادر کی مدح میں ہے۔ اسمیں دو مطلع ہیں پہلا مطلع یہ ہے ؎

رات کو مطلق نہ تھی یاں دل کو تاب
آشنا ہوتا نہ تھا آنکھوں سے خواب

ساتواں قصیدہ بھی نواب صاحب موصوف کی مدح میں ہے۔ اسمیں تین مطلع ہیں۔ مطلع اولی یہ ہے۔

ہم اسکئے ہیں زبس شکوۂ فلک تحریر
سیہ ہی کاغذ مشکین کے رنگ لوح ضمیر

مندرجہ بالا تمام قصائد ایسے ہیں جن کا زیادہ حصہ داخلی اور خارجی دونوں قسم کی شاعری کے لحاظ سے ایک اعلےٰ درجہ رکھتا ہے اور کمتر حصہ ایسا ہے جس میں دوسرے قصیدہ گوؤں کی طرح اغلاق اور تصنع پایا جاتا ہے۔ اس نقص کا سبب محض یہ ہے کہ قصیدہ کے جو عام اصول ہیں ان پر عمل کرنا اکثر مواقع پر میر صاحب کے لئے ناگزیر ہوجاتا تھا۔

اب مختلف شعبہ جات قصیدہ کے کچھ منتخب اشعار ملاحظہ ہوں۔

قصائد میر کی تشبیب

جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے کہ قصیدہ میں تشبیب ہی ایسی شئے ہے جس میں شاعر کو زور طبیعت دکھانیکا پورا موقع رہتا ہے۔ اصولی طور پر اس کے تین شعبے کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) محاکات (۲) تغزل (۳) اخلاقیات۔
محاکات کا مفہوم الفاظ کے ذریعہ مصوری ہے۔
تغزل کا مفہوم عاشقانہ رنگ کی تمہید ہے۔
اخلاقیات کا مفہوم اخلاقی اور حکیمانہ مضامین کا ذکر ہے۔
قصائد میں سے ان تینوں اقسام کی تشابیب ملاحظہ ہوں۔

مصوری یا محاکات دیکھیے

جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروز حمل — رنگ گل جھکے ہے ہر پات ہری کے اوجھل
جوشش گل ہے یہی جہاں تک کہ کرے کام نظر — لالہ و نرگس و گل سے بھرے دشت و جبل
لطف روئیدگی ست پوچھیے کہ میں شبنم ہوں — سبزہ خطاں لب جو پہ کہ جو آب کنول
چشم رکھتا ہے تو حاصل فیض ہو آنکھ تک دیکھ — نرگس اگتی ہے جہاں بوئے تھو دہقان نے بصل
خون تمنا زہ کش عاشقی غنچہ گل — دو نوں نکلے ہیں تہ خاک سے اب مست و بل

برگ گل شگفتہ ہوا کرتا ہے ہرا خنگ کو!
آگ کی گر کہیں سلگا کے رکھی ہے مشتعل

میر

مندرجہ بالا اشعار میں محاکات دو قسم کے ہیں۔ ایک[1] تو حقیقی محاکات دوسرے[2]
محاکات مع التخیل۔
حقیقی محاکات کے سلسلہ میں مطلع خاص طرح سے قابل لحاظ ہے جس میں آمد بہار کی
سچی تصویر کھینچی گئی ہے۔ علی الخصوص دوسرا مصرع "رنگ گل جھکے ہے ہر پات ہری کے اوجھل"
پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں اوسی بے تصنع طبیعت کی اختراع ہوں جس نے اردو شاعری میں
چار چاند لگا دئے ہیں۔ مطلع کو پڑھیے اور آنکھیں بند کر لیجیے تو معلوم ہوگا کہ پھولوں سے
لدی ہوئی ہری ہری ٹہنیاں نگاہوں کے سامنے جھوم رہی ہیں۔
میری رائے میں کم از کم اس خصوصیات کے اعتبار سے قصیدہ صاحب سودا سے بڑھا

کہیں آگے بڑھے ہوئے ہیں۔

یہی بات جو میر صاحب نے اپنے مطلع میں کہی ہے سودا نے بھی بیان کرنیکی کوشش کی ہے۔

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستان سے عمل
تیغ اُردی نے کیا ملک خزان مستاصل

لیکن وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو میر صاحب کے مطلع میں ہے۔ اسی طرح دوسرا شعر ہے

جوشش گل پہ ہے جہان تک کہ کرے کام نظر
لالہ و نرگس و گل سے ہیں بھرے دشت و جبل

بھرپور بہار کا ایک ایسا مکمل نقشہ ہے جسکو پڑھکر کھہارے رنگا رنگ سے بھرے مرغزار اور کوہسار نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

یوں ہی تیسرا شعر ہے

لطف روئیدگی مت پوچھہ کہ ہیں شبہ میں ہوں
سبزہ غلطاں ہے لب جو پہ کہ خواب مخمل!

پڑھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شفاف نہر کسی شاداب سبزہ زار کو چیرتی ہوئی بہہ رہی ہے۔

انہیں اشعار میں اب محاکات کی دوسری قسم ملاحظہ ہو۔

محاکات مع التخیل کے دو شعبے ہو سکتے ہیں۔ اول وہ تخیل جن کا تعلق تاثر قلبی سے ہے۔ دوسرے وہ تخیل جو خالص دماغی ہیں۔

تاثر قلبی سے تعلق رکھنے والے تخیل کے سلسلہ میں میر صاحب کے مندرجہ بالا اشعار میں سے چوتھا اور پانچواں شعر ملاحظہ کیجیے۔ مکرر نقل ہیں ہے

چشم رکھتا ہے تو چل فیض ہوا کو ٹک دیکھہ
نرگس اگتی ہے جہان بوئی تھی دہقان نے بصل

خون خمیازہ کش عاشقی و بیخ گل
دونوں اگلیں ہیں تہہ خاک سے اب ست و بعمل

ان اشعار کو پڑہکر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خصوصیت بہی صرف میر صاحب میں سودا کے مقابلہ مین ممتاز تہی۔
خالص دماغی تخیل میر کے آخری شعر مین دیکھیے ؎

برگ گل عقیق ہوا کرتا ہے ہرا خنگر کو
آگ کی گہر کہین سدگاکے رکہے ہین منفعل

چونکہ اس قسم کے مضامین کو قصیدہ کی دنیا مین نہایت اہم سمجہا جاتا ہے لہذا میر صاحب نے بہی انہین آرستا کہہ لیا ہے ورنہ ان کی طبیعت کو ان سے کوئی مناسبت نہ تہی اور اس قسم کے تخیل کا مصداق ہمیشہ سودا کے ہاتہہ رہا ہے۔
تشبیب کی دوسری قسم تغزل ہے جس مین شاعر کوئی مسلسل عاشقانہ مضمون بطور تمہید بیان کرکے اصل موضوع کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شعبۂ خاص مین میر صاحب جن کا تغزل مسلم طور پر بہترین مانا جا چکا ہے کتنے کامیاب رہے ہونگے۔ چند اشعار نمونتاً درج کرتا ہون ؎

اک شب کیا تہا یار تری زلف کا خیال
اب تک ہے دشمنی مین مری میرا بال بال

مین مر گیا فراق مین پر اب یہ کیا ہے ظلم!
جیتے گڑی ہے ساتہہ مرے حسرت وصال

جنبش ہوئی مژہ کو ادہر گڑ گئی سنان!
ابرو ترے ہلے کہ ادہر کٹ گیا ہلال

دو رخ ہی میرے شرم گنہ کے عرق مین غرق
لیکن نہین ہنوز مجہے ٹک بہی انفعال

خوش قامتی کو آہ کی کب پہونچتا ہے سرو
ہے یہ تو باغ رنگ شکستہ کا نونہال

یک روز بے نقاب ہوا تہا تو صبح کو
اب تک ہے آفتاب جہان تاب پر زوال

تہی سیر تیرے کوچہ مین عشاق کا معاش!
کتنے شکستہ دل تہے بہت تہے خراب حال

جیتے غرض تہے سب کو یقین تہا کہ مر چکے!
کوئی نہ تہا کہ جس کو ہو جینے کا احتمال

میر

تیسری قسم تشبیب کی اخلاقیات ہے۔ اس قسم کے شامل قصیدہ ہونیکے میرے خیال مین دو سبب ہو سکتے ہین۔ اول یہ کہ بادشاہون کی مدح سے قبل اونہین کچھ حکیمانہ اور اخلاقی باتین ایک دلچسپ شاعرانہ عنوان سے بتائی جائین تاکہ وہ امور سلطنت مین ان سے فائدہ اٹھاکر رعایا کیلئے کارآمد و مفید بن سکین۔
دوسرے یہ کہ ایسے روحانی ممدوح کی مدح سے قبل (جس کے اخلاق کی سطح عالم اخلاقی سے بہت بلند ہے) جو تمہید بیان کی جائے گی اوسے قدرتاً حکیمانہ اور اخلاقی ہونا چاہیئے۔

اس مین شک نہین کہ میر صاحب نے اس شعبہ مین بھی خوب کہا ہے لیکن پھر بھی وہ سودا کے برابر کامیاب نہ رہ سکے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ایک عالم وجد کے شاعر تھے۔ لہذا اونہین خشک مواعظے سے بہت زیادہ ربط نہ رہ سکا۔ میر صاحب نے جہان کہین اخلاقی تشبیب نظم کی ہین اوس پر عشقیہ رنگ اتنا غالب ہے کہ اوسے خالص اخلاقیات کی سرخی کے تحت مین درج کرنا مشکل ہو جائیگا۔ جیسے ؎

ہوا کیے ہین زبس شکوۂ فلک تحریر	سیہ کاغذ مشکین کے رنگ لوح ضمیر
کرون نہ شکر جفاہائے آسمان کیون کر	مری خرابی مین اون نے نہ کی کوئی تقصیر
دیا ہزارون کو دست اون نے خانہ سازی کا	دل شکستہ کو میرے کیا نہ ٹک تعمیر
دماغ رفتہ شگفتن سے آشنا نہ ہوا	کہ اس چمن مین رکھا اون نے غنچہ سا دلگیر

دراصل مصائب مین شکر ایک بہت بڑا اخلاقی مسئلہ ہے۔ مگر میر صاحب نے اوسے خالص غزل بناکر پیش کیا ہے۔ البتہ خال خال میر صاحب کے قصائد مین خالص اخلاقیات کے نمونے بھی ملتے ہین۔ مگر وہ اتنے کم ہین کہ اون کا ذکر کرنا عبث ہے۔ اب کچھ نمونے میر صاحب کی تشابیب کے درج ذیل کیے جاتے ہین۔ جن کا لطف مندرجہ بالا اصولون کی روشنی مین حاصل کیجیے۔

ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

نکلے ہے لالہ زمیں چاک کر اب سینۂ دل ! — آتش گل سے جلا کرتا ہے سارا جنگل
تیرگی اپنے ستاروں کی ہے سب پر روشن — آفتاب آتا ہے یاں دن کو جلا کر مشعل
غنچۂ خام کو جوں پھونک سے کھولے ہے طفل — یوں ہی کر دیکھا یہ دل عقدہ ما لاینحل
تو یوں ہی کھینچتا ہے نقش بر آب اے منعم — کتنی محبوب گئیں صورتیں اس خاک میں رل
جس دل مفت سے ہے سینے میں عجب کیا ہے جو ہے
غمزہ دے دزدہیں آنکھوں سے چرالیں کاجل — میر

ایک دوسرے قصیدے میں ارشاد ہوتا ہے ؎

تیغ سو دل پہ آتے ہیں اندوہ اب مدام — پہونچے ہے مجھکو داغ گل جنگ صبح و شام
اسے کج روش تو نامہ نہ لکھ بھیج مت پیام — قاصد کا میرے شہید کی طرح سے تو لے سلام
دل میں نہیں ہے قطرۂ خوں آنکھیں ہیں گی تر — خالی پڑا ہے شیشۂ مئے بھر رہا ہے جام
اسے رشک ماہ عید نہ کر انتظار کش — مکھڑا دکھا دے چاند سا ٹک آکے پشت بام
زنجیر پا ہے اسکی تری زلف غالباً — مدت ہوئی نسیم نہیں کرتی احتشام
چلتا ہے تو جاتے ہیں کتنوں کے جی چلے — آ آپ کسو کی مان کے موقوف کر خرام
گر جانتا مژہ کو تری تیغ کہیں تو میں ! — دو چار چاہیں اور بھی کرلاتا قرض و دام
رونے کا تار باندھ تصور ہے روز و شب — ہے آنسوؤں کا سلک گہر کا سا انتظام
اک دن تری گلی میں گیا تھا میں سیر کو — لبریز ہوئے خون سے ہے اب تک مرا مشام
صیاد نے اسیر کیا تجھکو بر عبث ! — میں ٹک جیا نہ فرط تپیدن سے زیر دام
آنکھوں سے اسکی چشم وفا رکھنا ہے غلط
وحشی ہوا ہیں یہ غزال ہونگے کسی سے رام !

ایک اور جگہ سے

وقت ہے اپنے نصیری کی مدد کا یا شاہ !
روز و شب رہتی ہے اس موذی سے ہی جنگ و جدل
میر

ایک دوسرے قصیدے میں دنیا دی منصبوں کی مدح سرائی کرتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام پر اس طرح آتے ہیں ؎

کب تک صفت بتوں کی خدا سے تو خوف کر — اے طبع وہ نہ آتی ہی پابند خط و خال
پڑھ منقبت نہ شاہ کی جس سے نجات ہو — وہ شاہ جس کے ایک گدا کو ہے یہ کمال

بخشش سے جن کی حرف طلب محو ہو گیا
کب اوس کے وقت میں ہے بہت نوبت سوال
میر

اپنے عشق کا حال بیان کرتے ہوئے امام حسین علیہ السلام کی مدح اس طرح کرتے ہیں ؎

سوائے نالۂ جانسوز کون ہے دل سوز — بعینہ آہ سحرگاہ کون ہے غم خوار
جنون میں جب سے خوش آیا لباس عریانی — نہیں ہے دامن صحرا میں تب سی مجھکو قرار
ہمیشہ ساتھ ہو دامن سوار لڑکون کے ! — مگر کہ خاک وفا سے بنا ہی میرا غبار
عجب ہے مجھکو جو تو دیکھنے نہیں آتا ! — رہا ہوں ایک تری انکھڑیوں کا میں بیمار

مطلع

ہوا ہوں جور فلک سے بہت ہی زار و نزار — پہنچیو یا خلف الصدق یا حیدر کرار

ان چند مثالوں سے میر صاحب کے گریز کے حسن کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے
اب مداحی ملاحظہ ہو۔

میر صاحب کی مداحی

گریز کے بعد قصیدہ میں مداحی کی باری آتی ہے۔ اور یہی چیز قصیدہ کا اصل موضوع سمجھی جاتی ہے۔ بعض قصائد تو ایسے ہوتے ہیں جن میں ابتدا ہی سے ممدوح کی مدح شروع کر دی جاتی ہے

ایسے قصائد "قصائد خطابیہ" کے نام سے تعبیر کیے جاتے ہیں اور انہیں دبستانِ قصیدہ میں کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔

بعض قصیدہ گو حضرات نے قصیدہ میں بجائے مدح کے قدح بھی کی ہے۔ لیکن ان قدح والے قصائد کا ذکر قصیدہ کی سرخی کے تحت میں کرنا غلطی ہے۔ ایسے قصائد صرف ہجو کہے جا سکتے ہیں۔

اصل قصیدہ گوئی صرف مداحی کو کہا جاتا ہے جس کی دو قسمیں ہیں۔ اول وہ مدح جو کسی روحانی پیشوا یا کسی ایسے بزرگ کی ہو جسے شاعر بالاخلاص اوس مدح کے لائق سمجھتا ہو۔ دوسرے وہ مدح جو کسی بادشاہ یا صاحب دولت کی ہو۔

پہلے اولی الذکر مدح کے چند نمونے کلامِ میر سے درج کیے جاتے ہیں:۔

حضرت علی علیہ السلام کی مدح میں فرماتے ہیں ؎

اے کہ اک تو ہی ہوا عالمِ اسرارِ ازل — اے کہ سو جان سے عاشق ہی ترا حسنِ عمل
تیری وہ ذات مقدس ہی کہ لیتے ہوئے نام — منہہ سے ناخواستہ بھی صلِ علی جائے نکل
دور از بسکہ ہا کہا عرش سے رتبہ ترا — حرف تیرا ہی ترے شیفوں کی وحی منزل
فرش ہونا ترے زائر کا سعادت تھی وسنے — کیا کہے جادر مہتاب کہ تھی مستعمل

لقمہ ظلم نہیں بجتا عدالت میں تری!
باز نگلی ہوئی چڑیا کے تئیں دے ہے اگل — میر

پھر ایک دوسرے قصیدہ میں حضرت علی کی مدح ؎

تو وہ در مدینۂ علم علیم ہے — جس شخص کو نہ آئے الف بے و دال و ذال
آوے تری جناب مقدس میں ایک دم — کرتے ہیں وان تو وقف سبھی طرز کے مقال
عالم ہوا سقدر کہ بیاں کیا کرے کوئی — پھر بحث اس سے عقل فلاطون پر سے دال
جب تک جیوں میں دل میں مرے آرزو ہی یہ — ہوں سر سے تیرے زائرِ درگہ کا پائمال

پھر بعد مرگ حوض پہ کوثر کے یا علیؑ
جاگہ ہو میری حشر کو تیری صف نعال — میرؔ

ظاہر ہے کہ ایک شیعہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میر صاحب کو حضرت علی علیہ السلام سے کیا خلوص ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مندرجہ بالا اشعار کے پردے میں سچی بھگتی کا جذبہ جھلک رہا ہے۔ اب دوسری قسم کی مدح ملاحظہ ہو۔

نغمۂ آشیاں نواب آصف الدولہ کی مدح میں فرماتے ہیں ؎

اے ترے ڈر سے جگر شیروں کے آب — دشمنوں کو رو بہا تا اضطراب
مدعی کی صف ہی کونچوں کی قطار — لشکری اس فوج کا ہر اک عقاب
موج زن جیدھر ہو وہ دریائے فوج — بستیاں اس سمت کی جیسے حباب
رفع بدعت چاہیے تو تو کیا مجال — اٹھ سکے جو نغمۂ چنگ و رباب
منع جیسے ہوئے تو پھر قدرت ہی کیا — جو گلے سے شیشے کے اترے شراب
خوبیاں ہیں خوبیاں سر تا قدم — تب کیا صانع نے تجھکو انتخاب

جو کہے تو چاہیئے وہ لکھ رکھیں!
حرف ہر اک تیرے منھ کا ہے کتاب — میرؔ

اسی طرح ایک دوسرے قصیدے میں نواب صاحب موصوف کی مدح کرتے ہیں۔

تمام قدرت آصف صفت سلیمان جاہ — سواد دولت گنجینہ بخش دشمن گیر
فلک شکوہ ستارہ حشم خدیو جہان — ترے جلال کو کن لفظوں میں کروں تحریر
زہے علوئے مراتب کہ وریہ بار نہ پائے — ہزار بار اگر چرخ مارے چرخ اثیر
رواں ہو صبح کا گر مرکب ظفر پیکر — تو تا بہ شام کرے روم و شام کو تسخیر

گیا ہے شور ترے عدل کا جو گردوں تک
رتاں سے آنکھ چھپاتا رہے ہے مدر منیر — میرؔ

یہ ضرور ہے کہ اہل دولت کی مداحی اعلیٰ شاعری نہیں کہی جا سکتی۔ کیونکہ ایسے موقع پر شاعر اپنے ضمیر کے خلاف قوت شعری سے کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ جس میں اوسے کامیابی ہونا ناممکن ہے۔ لیکن میرؔ صاحب کے مندرجہ بالا اشعار کے لیئے یہ فیصلہ صادر کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔ کیونکہ اون کے کیرکٹر کو دیکھتے ہوئے ہر شخص سمجھہ سکتا ہے کہ وہ خوشامد کے قریب بھی نہیں آ سکتے تھے۔

نواب آصف الدولہ وہی ہیں جو جناب قبلہ اور اسی قسم کے دیگر معزز الفاظ سے میرؔ صاحب کو سر عام مخاطب کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میرؔ صاحب جھڑک کر منہہ پھیرے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ پھر بھلا انہیں کی خوشامد میر صاحب سے کیونکر ہو گی۔

مندرجہ بالا اشعار کا جوش و شکوہ صاف بتا رہا ہے کہ انکی تاثرات قلبی نمایاں طور پر جھلک رہے ہیں۔ میر صاحب نے جس جذبے کے ساتھہ یہ اشعار کہے ہیں وہ در اصل خوشامد نہیں بلکہ احسان مندی ہے۔ نواب صاحب کے لا انتہا احسانات نے میر صاحب کے قلب کو ایسا متاثر کیا کہ یہ اشعار خود بخود ابل پڑے۔

واقعہ یہی ہے کہ نواب صاحب نے میر صاحب کے ساتھہ جو مراعات کی ہیں اون کا بدلہ کرنے کے لیئے میر صاحب کے پاس سوائے جلبش سخن کے اور کوئی شئے موجود نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میر صاحب نے دل کھولکر نواب صاحب کی مدح کر کے تاریخ میں فی الجملہ ان کے وقار میں اضافہ کر دیا ہے۔ جو مورخ میرؔ صاحب کی کہی ہوئی مدح دیکھے گا اوسے فطرت اس نکتہ پر غور کرنے کے لیئے مجبور کرے گی کہ "میر جیسے بے نیاز فقیر نے جکی مدح کی اوسکی شخصیت کیا ہو گی؟"

عام قصیدہ گو حضرات کی اس قسم کی مدح اور میر صاحب کی مدح میں فرق یہی ہے کہ انکا مقصد خوشامد رہتا ہے اور میر صاحب کا مطلب بدلہ احسان اتارنا۔ بہرحال میری رائے میں مدح گوئی میں میر صاحب تمام اردو قصیدہ گویوں میں بلند مرتبہ ہیں۔

میر صاحب کی دعا

سب سے آخر شئے قصیدہ میں دعا ہے۔ دعا کا لہجہ ہمیشہ اسیوقت موثر ہو سکتا ہے جب قلب میں سوز و گداز ہو۔ ظاہر ہے کہ میر کا سوز و گداز کس پایہ کا تھا۔ ایسی حالت میں یہ خیال کوئی بیجا نہیں کہ اون کے دعائیہ اشعار کامیاب ہنا چاہئے۔ نمونتاً چند شعر سن لیجئے۔

ایک حضرت علی علیہ السلام کی مدح کے قصیدہ کا اختتام صرف ایک شعر میں اس دعا پر کرتے ہیں ؎

ہوئے حرام ترے محبوں کو درد و غم
شمشیر دوستان پہ ہو خون عدو حلال

امام حسین علیہ السلام کی مدح کے قصیدہ کا اختتام اور روضہ اقدس پر پہونچنے کی دعا ؎

یہ آرزو ہے مرے دل میں مدتوں سے تھا
رہے نہ بعد میرے سر میں یہ مشت غبار
اڑا دے اسکو صبا یاں تلک کہ ہے پہونچے
تجھ آستان کے آگے کہ ہے فلک کردار

نواب آصف الدولہ کی مدح کے قصیدہ کی دعا

کر دعا پر میر اب ختم سخن!
تو کہے جو کچھ کرے حق مستجاب
زیر دست اوسکے رہیں گردن کشان
تا قیامت وہ رہے مالک رقاب

دوست اوس کے جوش زن جیسے محیط!

خاک بر سر مدعی جیسے سراب

یہ ہیں میر صاحب کی مختصر مگر پر خلوص دعائیں۔ اگر ان کو کوئی شاعرانہ اہمیت نہیں دی جا سکتی تو بے لطف بھی نہیں کہا جا سکتا۔

میر صاحب کی مثنوی گوئی

لغت میں مثنوی کے معنی تثنیہ شدہ کے آئے ہیں۔ اس صنف کا نام مثنوی ہونے کا خاص سبب یہ ہے کہ اس کے ہر شعر کے دو قافیہ الگ الگ ہوتے ہیں۔ بالعموم مثنوی میں شاعر کوئی قصہ منظوم صورت میں بیان کرتا ہے۔

چونکہ اس صنف میں نسبتاً قافیوں کی پابندی کم ہوتی ہے۔ لہذا اسی اعتبار سے یہ صنف ایک آسان ترین صنف سمجھی جاتی ہے لیکن اس کی ذمہ داریوں کے اعتبار سے میرے خیال میں اسے دقیق ترین صنف کہنا چاہیے۔

ایک مثنوی گو پر وہ تمام ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جو ایک فسانہ نگار پر ہونا چاہیے۔ مثلاً علاوہ قوت بیان کے ایک مثنوی گو کے لئے ضروری ہے کہ اس نے فطرت انسانی کا عمیق مطالعہ کیا ہو۔ تمام سوسائیٹیوں کے مذاق اور وقوعات عالم سے باخبر ہو۔ مختلف ازمنہ کے رسم و رواج اور تمدن کا علم رکھتا ہو۔ دنیا کی طبعی اور غیر طبعی جغرافیہ سے متمسک ہو وغیرہ وغیرہ کیونکہ ان سب کی ضرورت ایک قصہ کے بیان کرنے میں پیش آسکتی ہے۔

میرے خیال میں مثنوی ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں شاعر کی داخلی اور خارجی دونوں قسم کی قوت شعری کا پوری طرح اندازہ ہو سکتا ہے کیونکہ مثنوی میں کہیں وہ عشق و محبت۔ وقوعات فطرت اور جذبات انسانی کا فلسفہ بیان کرتا ہے کہیں مختلف سانحات یا مناظر کی تصویر کھینچتا ہے۔ غرض طرح طرح سے کبھی اپنا قصہ پڑھنے والے کو ہنساتا ہے کبھی رلاتا ہے کبھی جوش دلاتا ہے کبھی خائف بناتا ہے۔

اس ہمہ گیر صنف میں ظاہر ہے کہ میر صاحب کی طبیعت کیونکر رک سکتی ...

انہون نے بھی بہت سی مثنویان کہین ہین۔ جن کی تفصیل اون کی تصنیفات کے تحت مین درج ہو چکی ہے۔ یہ مثنویان کس پائے کی ہین؟ اس کے متعلق محققین کی آراء کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باستثنائے چند میر صاحب کی تمام مثنویان ایسی ہین جن کا شمار اردو لٹریچر کی بہترین مثنویون مین ہوتا ہے۔ اردو مین جتنے مثنوی گو گذرے ہین وہ سب میر صاحب یا میر حسن کے خوشہ چین تھے۔

اب مین صنف مثنوی کے مختلف شعبہ جات کے تحت مین میر صاحب کا کلام پیش کرتا ہون جس سے اون کے کمال کا اندازہ ہو جائے گا۔

اصولی طور پر مثنوی دو شعبون مین تقسیم ہے۔ جن مین سے پہلی شئے تو وہ فرضی یا حقیقی قصہ ہے جسکو شاعر بیان کرتا ہے۔ دوسری چیز اوس کا بیان یا طرز ادا ہے۔ یعنی ایک مثنوی مین دو ہی چیزین دیکھی جاتی ہین۔ اول یہ کہ جو قصہ بیان کیا جا رہا ہے وہ کیا ہے؟ دوسرے شاعر نے اوسے بیان کیونکر کیا ہے۔

مثنوی کے اول الذکر شعبہ مین دو چیزین قابل لحاظ ہین۔ اول قصے کا پلاٹ دوسرے کیرکٹر

پلاٹ

پلاٹ، واقعات کے اوس مجموعہ کو کہتے ہین جو کسی قصہ مین بیان کئے جائین ایک پلاٹ کی کامیابی کا دار و مدار میری رائے مین حسب ذیل باتون پر ہے۔

اول یہ کہ جو واقعات پلاٹ مین بیان کئے جائین محیر عقل اور ناممکن الوقوع نہون۔ اگر کسی پلاٹ کی بنار ایسے واقعات پر ہے تو وہ کامیاب پلاٹ نہ سمجھا جائے گا۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ حسب ذیل صورتون مین محیر عقل اور ناممکن الوقوع باتین بھی بیان ہو سکتی ہین۔

اول جب کسی قوم کے اعتقادی قصص (Mythology) بیان کئے جائین

جیسے ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ وغیرہ جس میں مسیحیت کے اعتقادی افسانے بیان ہوئے ہیں۔
دوسرے جب طلسم و سحر ساحری کے قصے بیان ہوں جیسے طلسم ہوشربا یا Tempest وغیرہ۔
تیسرے جب کسی نادیدہ مخلوق مثلاً (جن۔ بھوت۔ پری وغیرہ) کے قصے بیان ہوں۔ جیسے گلزار نسیم (A mid summer nights dream) مڈسمر نائٹ ڈریم وغیرہ۔
اس میں شک نہیں کہ مندرجہ بالا صورتوں میں محیر عقل اور ناممکن الوقوع واقعات کو بڑا نا قریب قریب ناممکن سا ہے۔ لیکن میری رائے میں افسانہ نگاری کے عام اصول کے مطابق ایسے پلاٹ اعلیٰ درجہ کے نہیں کہے جا سکتے۔
بس ایک عمدہ پلاٹ میں تو زیادہ سے زیادہ ایسے ہی محیر عقل واقعات درج ہو سکتے ہیں۔ جو مادی اسباب سے ممکن الوقوع ہوں۔ لیکن پھر بھی جہاں تک ہو سکے ایسے واقعات کو نظر انداز کرنا چاہیئے تاکہ قصہ پڑھنے والے کو ذرا بھی ثقل اور گرانی نہ محسوس ہو۔
مشرقی افسانوں کو دیکھتے ہوئے میر صاحب کے یہاں محیر عقل واقعات بہت کم ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کی مثنویوں کے پلاٹ اس نقص سے بالکل پاک نہیں جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ آج جس شئے کو ہم نقص سمجھ رہے ہیں اس اعتقاد پرست اور توہم پرست دور میں اسے حسن سمجھا جاتا تھا۔ خواہ اس کو حسن سمجھا جائے یا عیب۔ مگر میر صاحب میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ عقائد شاعرانہ (Poetic conviction) کو کسی موقع پر نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔
مثلاً وہ اپنی مثنوی شعلۂ عشق میں "پرسرام کی بیوی کے مرجانے کے بعد" پرسرام کا اضطراب دکھاتے ہوئے تاثرات عشق کو اپنے اعتقاد شاعرانہ کی بنا پر انتہا اہمیت

دیتے ہیں کہ ایک دن پرسرام دارفتگی میں روتا ہوا دریا پر گیا اور شب کو گھر نہ پلٹا۔ وہیں
اوسے ایک ماہی گیر کی زبانی معلوم ہوا کہ اس دریا پر روز آسمان سے ایک شعلہ آتا ہے
اور کہتا ہے کہ "ہائے پرسرام تو کہاں ہے"۔ عدم میں بھی تیرا ہجر مجھے بےچین کر رہا ہے"۔
پرسرام کی آتش شوق اس شعلے کی زیارت کیلئے مشتعل ہوئی ہے۔ اور وہ ماہی گیر کے
ساتھ اوس مقام پر جاتا ہے جہاں شعلہ روز آیا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ شعلہ اس دن بھی
اوسی طرح فریاد کرتا ہوا آیا۔ پرسرام نے آواز لبیک بلند کی اور شعلہ اوسے محیط کرکے
اپنے ساتھ لئے ہوئے آسمان کی طرف چلا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ اس واقعہ میں ایک شاعرانہ لطف ضرور ہے مگر پھر بھی اسے
افسانہ نگاری کی دنیا میں کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ اسکو یقین کرنا صرف
اُنہیں لوگوں تک محدود رہ سکتا ہے جو عشق کے ان محیر عقل تاثرات پر اعتقاد رکھتے
ہیں۔ ورنہ عام لوگ اسے کسی طرح باور نہیں کر سکتے۔ جس کے بعد ظاہر ہے کہ وہ اسے
پسندیدگی کی نظر سے کیونکر دیکھ سکتے ہیں۔

بہرحال جہاں اس قسم کے واقعات میر صاحب کی مثنویوں میں ہیں وہاں ایسے بھی
واقعات ہیں جو ایک اعلےٰ درجہ کے فسانہ نگار کے قلم سے نکل سکتے ہیں۔ میری رائے میں
بحیثیت مجموعی ان کی مثنویوں کے پلاٹ اچھے خاصے کامیاب پلاٹ کہلانے کے مستحق ہیں۔

دوسری بات پلاٹ میں یہ ہونی چاہئے کہ جو واقعات بیان کئے جائیں وہ کسی
خاص مقصد کیلئے نہ تراشے گئے ہوں۔ بلکہ آمد میں خود واقعات واقعات سے پیدا
ہوتے چلیں وہ پلاٹ نہایت ادنیٰ قسم کا سمجھا جاتا ہے جس میں مصنف خواہ مخواہ
اپنے مطبوع اصولوں کی عظمت اور فتح دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ عیب بھی مشرقی مصنفین میں ننانوے فیصدی پھیلا ہوا ہے۔ میر صاحب
ولی ایک فیصدی مصنفین میں سے ایک ہیں جن کے پلاٹ اس عیب سے فی الجملہ پاک ہیں

تیسرا حسن پلاٹ کا یہ ہے کہ جو واقعات بیان کیے جائیں وہ اتنے سطحی نہ ہوں کہ ایک ہی واقعہ سے پڑھنے والا اگلے واقعات خود معلوم کر لے بلکہ ہر واقعہ کا نتیجہ جو دوسرے واقعہ میں دکھایا جائے وہ اتنا عمیق ہو کہ عام نظریں اوسے اوس وقت تک نہ محسوس کر سکیں جب تک مصنف خود نہ ظاہر کرے۔ مثلاً ایک شخص کو زہر پینے کے لئے دیا گیا جسے پی کر وہ زمین پر گر پڑا۔ اس واقعہ کے بعد عام لوگ یہی نتیجہ نکالیں گے کہ مسموم مر گیا — لیکن افسانہ نگار آگے چلکر یہ دکھاتا ہے کہ جو زہر اس شخص کو پینے کے لئے دیا گیا تھا در اصل وہ زہر نہ تھا بلکہ اس زہر والے پیالے میں اس کے ایک دوست نے کسی تدبیر سے زہر کو پھینک کر دار وئے بیہوشی بھر دیا تھا جسے پی کر وہ شخص بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا —

یہ مذاق خال خال مشرقی قصص میں ضرور ملتا ہے مگر وہ اتنا کم ہے کہ اوسے مغربی قصوں کے مقابلہ میں ذرا بھی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

میر صاحب بھی ایک مشرقی ادیب ہونے کی حیثیت سے اس خوبی میں اتنا ہی حصہ رکھتے ہیں جتنا ان کا حق ہونا چاہیئے۔

کیرکٹر نگاری

جو واقعات کسی شخص کے متعلق بیان کئے جائیں اونکی نوعیت کا نام کیرکٹر ہے۔ اصولاً ہر سوسائٹی اور ہر خیال کے آدمی کے واقعات زندگی مختلف ہوا کرتے ہیں۔ بادشاہ اور گدا کے خیالات ایک نہیں ہو سکے زاہد اور رند کا طرز معاشرت مطابقت نہیں کر سکتا۔ تلوار کا دھنی سپاہی اور عیش پسند اہل دولت ہم مسلک نہیں بن سکتے۔ یہی وہ نازک فرق ہے جو کیرکٹر نگاری میں ظاہر کئے جاتے ہیں۔

کیرکٹر نگاری میں سب سے اہم بات جو قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ جو واقعات جس شخص کے متعلق بیان کئے جا رہے ہیں کیا واقعتاً وہ اوسی ماحول اور اوسی درجہ کے

آدمی سے ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔ اس اصول پر جتنی کامیابی سے عمل کیا جائے گا کیرکٹر اتنا ہی کامیاب سمجھا جائے گا۔

بالعموم کیرکٹر میں نقص تین صورتوں میں واقع ہوتے ہیں۔

اول یہ کہ افسانہ نگار اپنے قصہ میں اتنے زیادہ کیرکٹر جمع کرے جن کا نباہنا اس کے امکان سے باہر ہو جائے۔ ایسی صورت میں ایک خاص پیچیدگی قصے میں پیدا ہو جاتی ہے جس سے قصہ کی روانی بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔

میر صاحب کی مثنویوں میں یہ نقص بالکل مفقود ہے کیونکہ وہ کبھی اپنے قصہ کے کیرکٹر تین چار سے زیادہ بڑھنے نہیں دیتے اور اتنے مختصر کیرکٹروں کا نباہنا ذرا بھی مشکل نہیں ہوتا۔

دوسرا نقص Ideal character painting ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اظہار واقعات میں حدود فطرت کو بھول کر اپنے پسندیدہ یا مخالف شخص کے متعلق خواہ مخواہ ایسے اعلیٰ ترین یا ذلیل ترین واقعات لکھنا جس کا وہ عام نگاہوں میں مستحق نہ ہو۔

اس قسم کی کیرکٹر نگاری سخت معیوب سمجھی جاتی ہے کیونکہ ایسی صورت میں معاشرت کے عام وقوعات مصنف کی عقیدتمندی یا مخالفت کے پردے میں چھپ جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے قصہ میں مقبولیت عامہ حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ کیرکٹر کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قصہ خواہ فرضی ہی کیوں نہ ہو لیکن وقوعات فطرت سے بالکل مطابق ہو۔

"Ideal character painting" کی صرف اعتقادی مذہبی قصص میں اجازت ہے کیونکہ ایسے قصص کے ہیرو بالعموم وہی لوگ ہوتے ہیں جو راسخ الاعتقاد مذہبی لوگوں کے خیال میں معصوم یا عام سطح انسانی سے بلند ہوتے ہیں۔ ان سے اگر اعلیٰ ترین واقعات منسوب کئے جائیں تو نامناسب نہیں معلوم ہوتے۔ اسی طرح ان ہستیوں کی مخالفت کرنے والے بھی ذلیل ترین کہے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ (بقول مذہبی لوگوں کے) بہترین کا

مخالف بدترین ہی ہوگا۔
غرض سوائے اس مخصوص صورت کے Ideal character painting
سخت ممنوع ہے۔
یہ نقص البتہ میر صاحب کی مثنویوں میں خال خال ملتا ہے۔ مثلاً مثنوی شعلۂ عشق میں پرسرام کی بیوی کو جیسے ہی پرسرام کے مرنے کی خبر سنائی جاتی ہے وہ ایک آہ کھینچکر مرجاتی ہے۔ اس واقعہ کی شاعرانہ عظمت جو کچھ بھی ہو لیکن اس کے عدم مطابق فطرت ہونے میں کسی کو ذرا بھی کلام نہیں ہوسکتا۔ آج تک کہیں ایسا نہیں دیکھا گیا کہ بغیر کسی مادی سبب کے کوئی عورت اپنے شوہر کے مرنے کی خبر سنکر "فوراً" مرجائے۔ یوں ہی میر صاحب کی مثنویوں میں بعض بعض مقاما پر اسی طرح کے اور بھی واقعات موجود ہیں لیکن اون کی تعداد محاسن کے مقابلہ میں اتنی کم ہے کہ ہر شخص اونہیں باسانی نظر انداز کر سکتا ہے۔
تیسرا نقص کیرکٹر نگاری کا یہ ہے کہ افسانہ نگار اپنی کمزوری دماغ کی وجہ سے اپنے قصہ کے مختلف مقررہ اشخاص کے کیرکٹر بالکل یکساں بیان کرنے لگے۔ اور اون سے اس قسم کے واقعات منسوب کرے جو ایسے موقع پر خود اوس سے ظہور پذیر ہوتے۔
میر صاحب کی مثنویاں اس عیب سے بالکل پاک ہیں۔ وہ اپنے قصہ کے مقررہ اشخاص کا کیرکٹر ہمیشہ اون کے فرائض اور ماحول کی رعایت سے بیان کرتے ہیں۔ مثلاً مثنوی دریائے عشق میں چار کیرکٹر خصوصیت کے ساتھ قصے سے تعلق رکھتے ہیں:—
(۱) متعلقین محبوبہ (۲) دایہ (۳) عاشق (۴) محبوبہ۔
میر صاحب اپنے قصہ میں یہ چاروں کیرکٹر اوسی صورت میں پیش کرتے ہیں جیسے بالعموم متوسط طبقۂ خیال کے آدمیوں کا ہونا چاہئے۔
شرفا میں ننگ و ناموس کا خیال کس حد پر ہوتا ہے۔ اس کے لئے متعلقین محبوبہ کا کیرکٹر دیکھئے۔

جب عاشق کی وارفتگی نے راز محبت کو طشت از بام کر دیا تو محبوبہ کے اعزا اپنی شرافت کو بھول کر اوس کی جان کے درپے ہو گئے۔ لیکن ننگ و ناموس کا خیال پھر بھی اون سے الگ نہ ہو سکا۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

وارث اس کے بھی بدگمان ہوئے — درپئے دشمنیٔ جان ہوئے!
مشورت تھی کہ ماریے ڈالیں — دفعتاً اس بلا کے تئیں ٹالیں!
پھر یہ ٹھہری کہ ہونگے ہم بدنام — سبکے آخر کہیں گے خاص و عام
کیا گنہ تھا کہ یہ جوان مارا — کن نے مارا اسے کہاں مارا
ہوئے یہ خون خفتہ گر بیدار — کھینچنا ہوئے خفت بسیار
کیجیے ایک ڈھب سے اسکو تنگ — تا نہ عاید ہو اپنی جانب ننگ
تہمت خبط رکھیے اس کے سر — کیجیے سنگسار اوس کو پھر
دیکھے دیوانہ اس جوان کو قرار — ہو گئے سارے درپئے آزار
ایک نے سخت کہہ کے تنگ کیا — ایک نے آ کے زیر سنگ کیا
ایک آیا تو ہاتھ میں شمشیر — ایک بولا کہ اب ہے کیا تاخیر

کی اشارت کہ کودکان شہر!
آئے لبریز غصہ و پر قہر ‏— میر

اس تمام بیان میں متعلقین محبوبہ کے کیرکٹر کے فطری حدود کسی جگہ نظر انداز نہیں ہونے پائے ہیں۔ جو صورتیں میر صاحب نے بیان کی ہیں واقعتاً یہی صورتیں دنیا میں پیش آیا کرتی ہیں۔

اسی طرح دایہ کا کیرکٹر جو میر صاحب نے بیان کیا ہے وہ وہی ہے جو ایک پکی قطامہ عورت کا ہونا چاہیئے۔ جب مندرجہ بالا تدبیروں سے عاشق در جانان سے نہ ٹلا تو آخر محبوبہ کے اعزا میں مشورہ ہوا کہ اب رسوائی حد کو پہنچ جاتی ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ

محبوبہ کو رات کے وقت خفیہ طور پر کسی محافہ مین بٹہا کر یہان سے ہٹادیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی
کیا گیا اور اندہیری رات مین محبوبہ کو دایہ کے ساتہہ دوسری جگہ منتقل کیا جانے لگا۔ جذب محبت
نے عاشق کو خبر دی اور وہ بہی بانالہ وزاری محافے کے ساتہہ ہولیا۔ دایہ جو محبوبہ کی پاسداری
سے عاشق کی دشمن جانی تہی یہ عالم دیکہکر اپنے مکر کا جال اس طرح پہیلاتی ہے ؎

گوش زد دایہ کے ہوئے یہ سخن — تہی وہ استاد کار حیلہ و فن
پاس اوسکو[۱] بلا تسلی دی! — وعدہ وصل سے تشفی دی!
کاے ستم دیدہ غم دوری — ہوچکا اب زمانہ مہجوری
زار نالے نہ کر شکیبا ہو — عشق کا راز تا نہ رسوا ہو
سخت دل تنگ ہتی یہ غیرت ماہ — قطع تجہ بن نہ ہوسکے تہی راہ
تیرے آنے سے دل کشادہ ہوا — نشہ دوستی زیادہ ہوا
بزم عشرت کرینگے باہم ساز — ہوجیو اپنے دوست کا ہمراز
دیکہے اوسکو قریب ساتہہ لیا! — دل عاشق کو اپنے ہاتہہ لیا — میر

غرض اسی صورت سے راستے مین جو دریا پڑتا تہا اوسکو پار کرنے کیلیئے عاشق اور
محبوبہ کو لیکر دایہ کشتی مین سوار ہوئی اور حیلہ ہی ؎

بیچ دریا کے دایہ نے جاکر — کفش اوس نخل کی اوسکو دکہلا کر
پہینکی پانی کی سطح پر اک بار — اور بولی کہ او جگر افگار
حیف تیرے نگار کی پاپوش — موج دریا سے ہوئے ہم آغوش
غیرت عشق سے تو لا اسکو — چہوڑ مت یون بہتے پا اسکو
جس کف پا پہ رنگ گل ہو بار!
منصفی ہے کہ خار سے ہو نگار — میر

---

[۱] عاشق کو۔

اس پیرو سے میں دایہ کا مطلب یہ تھا کہ محبوبہ کی پاپوش نکالنے کے لیے عاشق دریا اور ڈوب کر مرجائے تاکہ یہ جھگڑا پاک ہو۔ یہ تھا دایہ کی قطامگی کا مرقع۔

اب اس کے بعد عاشق کا کیرکٹر اس طرح بیان کیا ہے ؎

سن کے یہ حسرت دایۂ مکار — اوس کے دل سے گیا شکیب و قرار
بے خبر کار عشق کی تہہ سے — جست کی اس نے اپنی جاگہ سے
تھا سفینہ ہیں با کہ دریا میں! — موج زنجیر ہو گئی پا میں
کہتے ہیں ڈوبتے اچھلتے ہیں — ڈوبے ایسے کہیں نکلتے ہیں!

عشق نے آہ کھو دیا اس کو
آخر آخر ڈبو دیا اس کو

میر

ایک سچے عاشق کے کیرکٹر کی اس سے زیادہ دردانگیز تصویر اور کیا ہو سکتی ہے۔
اب محبوبہ کا کیرکٹر ملاحظہ کیجیے۔

ایک شریف زادی جو عشق کی لگاوٹوں سے نابلد ہے جب اپنے عاشق کی وفاؤں کے عظیم الشان مظاہرے دیکھتی ہے تو فطرتاً اوس کے دل میں محبت کی خلش شروع ہو جاتی ہے اور اوس کا جذبۂ شرافت اپنے سچے چاہنے والے کے ساتھ شریف برتاؤ کرنے کی خواہش میں بدل جاتا ہے لیکن شرم و حیا اوس کے ارادوں کو اپنے دامن میں چھپائے رکھتی ہے حتیٰ کہ وہ اون کے اخفا کے لیے اکثر فریب دہی سے بھی کام لینے لگتی ہے۔

عاشق دایہ کی مکاری سے صرف محبوبہ کی پاپوش کے لیے ڈوب کر اپنی جان دے چکا ہے جس کے بعد ظاہر ہے کہ محبوبہ کے قلب کی کیا حالت ہو گئی ہوگی۔ میر صاحب کی زبانی اس حالت کو سنیے ؎

دایہ حیلہ گر ہوئی دل شاد — واں سے کشتی چلی برنگ باد
قصہ کوتاہ بعد یک ہفتہ — ہوئی وہ رشک ماہ زخود رفتہ

میر

کہنے لگی کہ اب تو اے دایہ — ہو چکا غرق وہ سر دریا یہ

تھے جو ہنگامے اسکے حد سے زیاد — ساتھ اس کے گئی وہ شور و فساد

شور و فتنے تھے اس ملک سارے — اب تو بدنامیاں ہیں بارے

مصلحت یہ ہے تجھ کو لے چل گھر — ایک دو دم رہیں گے دریا پر

دایہ بولی کہ اسکے سر اپا ناز — حسن کا تیرے در پہ روئے نیاز

اب تو میں فتنہ کو سلایا ہے — اس بلا کے تئیں ہٹایا ہے

کون مانع ہے گھر کے چلنے کا! — سد رہ کون ہے نکلنے کا:

پھر

یہ نہ سوچی کہ یہ بلا ہے عشق
گھات میں اپنی لگ رہا ہے عشق

غرض دوسرے دن صبح کو دایہ محبوبہ کو لیکر خوش خوش گھر کی طرف روانہ ہوئی
جس وقت کشتی پر دایہ اور محبوبہ جا رہی تھیں تو محبوبہ کہتی ہے

حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ — یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ

ہوش سے تھا کہ ہر کو ہم آغوش — تھا بلا طم سے کس طرف ہمدوش

تجھکو آیا نظر کہاں آ کر؟ — پھر جو ڈوبا تو کس جگہ جا کر!

مجھکو دکھیو نشان اس جا کا — میں بھی دیکھوں خروش دریا کا

ہیں میسر کہاں یہ سیر عبور — اتفاقی ہیں اس طرح کے امور

گو کہ میں گرچہ دایہ تھی کامل — لیک تہہ سے سخن کے تھی غافل

یہ نہ سمجھی کہ ہے فریب عشق! — ہے یہ ہمراہ رہ ناشکیب عشق

بیچ دریا کے جب کہا یہ حرف — یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف

پھر

یاں وہ بیٹھا حباب کے مانند
پھر نہ تھا کچھ سراب کے مانند

یہ سنکر محبوبہ کے جذبات عشق کی کیا کیفیت ہوتی ہے ؎

سنتے ہی یہ کہاں کہاں کرکر — گر پڑی قصد ترک جان کرکر
موج ہر اک کمند شوق تھی آہ — لپٹی اوسکو بہ رنگ مار سیاہ
دام گستردہ عشق تھا تہہ آب — جسکے حلقے تمام تھے گرداب
حسن موجوں میں یوں نظر آوے — نور مہتاب جیسے لہراوے
تھیں وہ اوسکی حنائی انگشتاں — غیرت افروز پنجۂ مرجاں
سر پہ جب دم وہ آب ہو کے بہا — سطح پانی کی آئینہ سا رہا
کشش عشق آخر اوس مہ کو
لے گئی کھینچتی ہوئی تہہ کو ! (میر)

اسی طرح کے بیسیوں اعلیٰ سے اعلیٰ کیرکٹر میر صاحب کی مثنویوں میں ملیں گے جن کا مکمل لطف صرف اصل مثنویوں کے مطالعہ ہی سے حاصل ہو سکتا ہے ۔

اب میں کسی قدر روشنی میر صاحب کے انداز بیان پر ڈال دینا ضروری سمجھتا ہوں ۔ انداز بیان کے سلسلہ میں حسب ذیل باتیں قابل لحاظ ہیں ۔

(۱) محاکات (۲) وقوعات کی سائینس (۳) تسلسل کلام (۴) انتخاب واقعات (۵) اختصار واقعات (۶) قدرت بیان (۷) نتائج ۔

محاکات

اوپر ظاہر کیا جا چکا ہے کہ الفاظ کے ذریعہ تصویر کشی کو محاکات کہتے ہیں ۔ مثنوی میں محاکات دو قسم کے ہوتے ہیں

(۱) داخلی کیفیات اور جذبات کی تصویر کشی ۔
(۲) مادی اشیا کی خارجی تصویر کشی ۔

جہاں تک محاکات کا تعلق ہے میرے خیال میں میر صاحب دنیا کے اون

معدودے چند شعرا ایسے ہین جو اس شعبہ کے بادشاہ سمجھے جاتے ہین۔ جیسے شکسپیر کالی داس۔ انیس وغیرہ۔
صرف مثنوی ہی نہین بلکہ ہر صنف سخن مین جہان کہین مصوری کی ضرورت پیش آئی ہے میر صاحب کی شاعری نے ایک مصور سے زیادہ کام کیا ہے۔ میرے نزدیک میر صاحب کی شاعری کی اہم ترین خصوصیت محاکات ہے۔ کسی شے کی سادگی کے ساتھہ تصویر کھینچنے مین میر صاحب اپنی نظیر آپ ہین۔ اون کی افسانہ نگاری سے بہت کچھہ روسی افسانہ نگارون کا طرز ملتا ہے جن کے محاکات تمام دنیا مین ممتاز ہین۔
سب سے پہلے مین داخلی کیفیات اور جذبات کی تصویرین میر صاحب کی مثنویون سے پیش کرتا ہون۔
مثنوی شعلۂ عشق مین ایک جوان کے حسن کی تصویر کھینچتے ہین ؎

کہ وان اک جوان تھا پرسرام نام — خوش اندام و خوش قامت و خوش خرام
جوانی کے گلشن کی وہ آب و رنگ — گلستان پہ کام اوسکی خوبی سے تنگ
جدہر نکلے رنگین ادائی کے ساتھہ — چلے جائین جی خوشنمائی کے ساتھہ
کہلے بال چلتا تھا وہ سرو ناز — قدم بوسی کو آتی تھی عمر دراز
جدہر کو وہ ٹک گرم رفتار ہو — قیامت ادہر سے نمودار ہو
نگہ گرم اوسکی جدہر جا پڑے — کہیے تو کہ اودہر کو بجلی گرے
وہ کافر بہوین ہوئین مائل جہاد — کرین سجدہ اس قبلے اسلامیان
سیہ چشم اوسکی وہ بدمست تھی — نگاہون سے شمشیر در دست تھی
خرامان نکلتا وہ جس راہ سے — قیامت تھی وان نالہ و آہ سے
فدا اسپہ جی جان ہر ایک کا — کہ مقصود دل تھا وہ ہر ایک کا

میر

مندرجہ بالا اشعار کو بغور پڑھیے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ حسن کی ایک پرکیف تصویر ہے جو طبیعت میں وجد پیدا کر رہی ہے۔

اسی طرح کچھ ایسے اشعار بھی سن لیجیے جن میں جذبات انسانی کا مرقع موقعہ کی رعایت سے کھینچا گیا ہے۔

پرشرام کے مرنے کی جھوٹی خبر امتحان محبت کے لئے اوس کی بیوی کو سنائی گئی تھی۔ جس سے اوس نے اپنی جان دیدی۔

اب بیوی کی نعش (ہندو رواج کے مطابق) جلا دی گئی ہے۔ پرشرام کی بپتا لکھیے۔ وفادار بیوی کا داغ ہجر شوہر کی کیا حالت کرتا ہے ؎

جب آگ اُس کے پیکر پہ سب چھا گئی — محبت عجیب داغ دکھلا گئی!
جگر غم میں یک لخت خوں ہو گیا — رکا دل کہ آخر جنوں ہو گیا
گئے ہوش و صبر اس کے یک بار گی — طبیعت میں آئی اک آوارگی
سراسیمگی سے بگولہ ہوا! — پھرے اس طرح جیسے بھولا ہوا
کبھو یاد کر اس کو نالاں رہے — کبھو ٹک جو بیٹھے تو حیراں رہے
کبھو متصل منہ پہ ہو آہ سرد — کبھو دست بر دل کبھو دل میں درد
ہوئی رفتہ رفتہ وہ وحشت زیاد — لگا بھاگنے سب سے وہ نامراد
کچھ اپنے بد و نیک کی سدھ نہیں — نکل جائے بہکا کہیں کا کہیں
کبھو جائے صحرا سے لادیں اُسے — کبھو روتے دریا پہ پاویں اُسے

کبھو خاک ملتا ہے منہ پہ کھڑا!
کبھو سے [illegible] پڑا!

میرؔ

ملال دلی کی کتنی بہتر تصویر کھینچی ہے۔ حقیقت نگاری اور جذبہ و فطرت کا احساس ان اشعار کی خصوصیت ہے۔

اسی طرح میر صاحب نے مادی اشیاء کی خارجی تصویرکشی بھی اس انداز سے کی ہے کہ اصل شے نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے جیسے ایک مصور اپنی تصویر میں کسی مادی شے کی غیر ممتاز باتوں کو رنگ آمیزی سے اس طرح ابھارتا ہے کہ دیکھنے والے کی نظر میں انہیں کسی طرح نظر انداز نہ کر سکیں۔ ٹھیک اسی طرح میر صاحب نے بھی اپنے شاعرانہ آرٹ کی تکمیل کی ہے۔ ذیل میں ایک شکارنامہ کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں جن میں یہ خصوصیت بہت ممتاز ہے۔

قریب ایک ملتا پہاڑی تھی دوان — لگا اوس سے کم کم تھا آب رواں
پہاڑی کہ تو وہ کہوں خاک کا — کہ انبار تھا خار و خاشاک کا
تھا ڈھی تھا اس کوہ کے ایک دشت — کہ دشوار تھا اس میں آدم کا گشت
ہوا بہ سیہ تو اور پانی سے لگے — قدم راہ چلتے ہوئے ڈگمگے
بچے جا کر تو اک مشقت سا شور — رکھے پاؤں دامن کو کھینچے بزور
فقط خار بن کیا کہوں جیسا تھا — کہ ہر پا ہی واں جھاڑ جھنکاڑ تھا
چلو ہے چلو ہے یہ چلتے نہیں — کہ اشجار آگے سے ٹلتے نہیں
نہ تو بیٹھیں نہ سر کہیں سر کاٹے کہیں! — مگر پیچھے پاؤں ہی رہ رہ گئے تھا
قیامت نمودار ہر ہر قدم — چلے کوئی کیا سر پہ کھلے قدم

کہیں پیچ کے نکلے کہیں جھک چلے!
کہیں مضطرب سے کہیں رک چلے

میر

ملاحظہ کیجئے آپ نے یہ شعر! میرے خیال میں اگر ایک مصور اسی منظر کی تصویر کھینچتا تو وہ ان باتوں کو کسی طرح نہیں دکھا سکتا تھا۔ بس یہی فرق شاعری اور مصوری میں ہے۔

واقعات کی سائنس

مثنوی میں شاعر کو اکثر اوقات اس بات کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنے ناظرین کو یہ بتائے کہ جو صورت پیش آ رہی ہے یا پیش آئے گی وہ کس کی تہہ میں کیا راز ہے۔

مغربی افسانہ نگار شاعر اپنے قصہ میں جابجا اس اصول پر عمل کرتے چلتے ہیں۔ لیکن مشرقی شعرا زیادہ تر شروع قصہ ہی میں بطور تمہید تمام قصے کی سائنس بیان کر دیتے ہیں۔ علی الخصوص قدیم شعرا اشراقین میں تو یہ بات بہت زیادہ پائی جاتی ہے میرے خیال میں موقع اور محل پر باقاعدہ طور پر وقوعات کی سائنس بیان کرنیکا طریقہ اردو اور فارسی شعرا میں سب سے پہلے میر انیس نے رائج کیا۔

ہاں سنسکرت شعرا میں کالیداس البتہ ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے اس قدیم زمانہ میں بھی اس ضرورت کا احساس کرکے اپنی تصنیفات میں اسے پوری طرح برتا ہے کالیداس کے علاوہ اول تو قدیم شعرائے مشرق میں یہ چیز ملتی ہی نہیں اور اگر کہیں خال خال ملتی بھی ہے تو وہ اتنی کم ہے کہ اس کا عدم اور وجود دونوں برابر ہیں۔

میر صاحب ایک تو پرانے شاعر ہیں۔ دوسرے ان کی مثنویاں اتنی مختصر ہیں کہ ان میں اس چیز کو ڈھونڈھنا ہی عبث ہے۔ ایک فطری شاعر کی حیثیت سے اون کے دماغ نے اس ضرورت کو محسوس ضرور کیا لیکن اون کے ماحول اور خیال اختصار نے غالباً اونہیں اس ضرورت کی تکمیل نہ کرنے دی۔

میر صاحب نے اس ضرورت کو محسوس کیا۔ اسکا پتہ اونکی مثنویوں کو بغور دیکھنے سے بآسانی چل سکتا ہے۔ مثلاً مثنوی "دریائے عشق" میں عاشق دایہ کی مکاری سے دریا میں ڈوب چکا ہے۔ اب میر صاحب کو یہ دکھانا ہے کہ معشوق بھی دریا میں ڈوبے گا۔ اور بعد مرگ دونوں کا وصل ہوگا۔ چنانچہ اس واقعہ کی سائنس دایہ کی حالت بیان کرتے ہوئے اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

یہ نہ سمجھی کہ عشق آفت ہے ! !   فتنہ سازی میں اک قیامت ہے

ہاک ہو کیوں نہ عاشق بیدل   کام سے اپنے یہ نہیں غافل

وصل جیتے نہ ہو میسر گر !   لائے معشوق کو یہ تربت پر

یاں سے عاشق اگر گئے ناشاد

خاک خوبان بہی اون نے کی برباد

لیکن ایسی مثالیں جستہ جستہ میر صاحب کے یہاں ملتی ہیں۔ اصل میں وہ اوسی عام مشرقی مثنوی گوئی کے طریقے پر عامل تھے کہ شروع قصہ میں بطور تمہید تمام قصہ کی سائنس بیان کر دی جائے جیسے مثنوی "دریائے عشق" کی ابتدا میں (جس میں ایک جانکاہ واقعہ عشق بیان ہوا) فرماتے ہیں ؎

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال   ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال

دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا   کہیں سینہ میں آہ سرد ہوا

کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا   کہیں سر میں جنون ہو کے رہا

کہیں رونا ہوا ندامت کا !   کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا

گہہ نمک آدکس کو داغ کا پایا !   گہ تہ تیغ چراغ کا پایا

وان تپیدن ہوا جگر کے بیچ !   یاں تبسم ہے زخم تر کے بیچ

تھا کہیں دل میں نالۂ جانکاہ   ہے کسی لب پہ ناتوانی کی آہ !

کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا   کہیں موجب شکستہ رنگی کا

کسی چہرہ کا رنگ زرد ہوا   کسی کہل کی رگ کے گرد ہوا

ایک دل سے اٹھے ہے ہو کر دود   ایک لب پر سخن سے ہے خون آلود

حسرت آلود آہ تھا یہ کہیں   شوق کی یک نگاہ تھا یہ کہیں

کشمکش اس کی ہے اک اعجوبہ   ڈوبا عاشق تو یار بہی ڈوبا

جس رنگین مگر پر درد طریقہ پر میر صاحب نے اپنے قصے کی تمہید پیش کی ہے اوسے پڑھ کر بس وہی لطف آتا ہے کہ جو مغربی شاعر شیلی کی نظموں سے حاصل ہوتا ہے :-
پڑھیئے اور سر دھنیئے۔

تسلسل کلام | مثنوی میں تسلسل کلام کی بھی بیحد ضرورت ہوتی ہے۔ ایک واقعہ دوسرے واقعہ سے اس طرح مربوط ہونا چاہیئے کہ پڑھنے والے کو مطلق اس کا احساس نہ ہونے پائے کہ سلسلہ بیان میں کوئی تعویق واقع ہوئی ہے۔

تسلسل میر صاحب کی مثنویوں کی ایک اہم خصوصیت ہے وہ مختلف نوع کے واقعات کو آپس میں اس طرح کھپاتے ہیں کہ ان واقعات کا مجموعہ خود ایک واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ "مثنوی دریائے عشق" میں جہاں سے آغاز قصہ کیا ہے۔ ایک عاشق مزاج نوجوان کا ذکر کرتے ہیں ؎

ایک جا اک جوان رعنا تھا	لالہ رخسار سرو بالا تھا!
عشق رکھتا تھا اوسکی چھاتی گرم	دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
سر میں تھا شور شوق دل میں تھا	عشق ہی اوس کی آب و گل میں تھا
الغرض وہ جوان خوش اسلوب	ناشکیبا رہے تھا بن محبوب — میر

یہیں سے ایک دوسرے واقعہ کا کس مضبوطی سے جوڑ لگاتے ہیں ؎

ایک دن بے کلی سے گھبرایا	سیر کرنے کو باغ میں آیا
کسی گل پاس وہ صنم ٹھہرا	کسی سبزے پہ ایک دم ٹھہرا
دل کی واشد سے بے توقع ہو	ہر شجر کے تلے بہت سا رو — میر

یہیں سے پھر تیسرا واقعہ بیان کرتے ہیں ؎

دیکھ گلشن کو ناامیدانہ	منھ کیا اوس نے جانب خانہ

دل کے رکھنے کا اوسکو اک غم تھا | راہ چلنے میں حال درھم تھا
ناگہ اک کوچہ سے گذار ہوا | آفت تازہ سے دوچار ہوا
ایک غرفے سے ایک مہ پارہ | تھی طرف اس کے گرم نظارہ

پڑ گئی اوسپہ اک نظر اوس کی
پھر نہ آئی اوسے خبر اوس کی

یون ہی تسلسل کے ساتھہ ہر مثنوی مین واقعات کی لڑی لگی ہوئی ہے جو آپس میں اسقدر مضبوطی سے دست وگریباں ہین کہ اگر ان مین سے ایک بھی ہٹا دیا جائے تو تمام مطلب خبط ہو جائیگا۔

انتخاب واقعات

ایک افسانہ نگار کا یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے قصہ کے وقوعات کا انتخاب کرکے صرف ضروری باتین درج قصہ کرے اور غیر ضروری باتونکو نظر انداز کر دے۔ کیونکہ قصہ کو غیر ضروری باتون سے طول دینے سے پڑھنے والے کے لئے پریشانی کا سامان مہیا کرنا ہے۔

دوسرے عالم متغیر مین ہر مقام پر ہر سیکنڈ مین اتنے کرور واقعات پیش آتے ہیں کہ جن کا پوری طرح ذکر محال قطعی ہے۔ اگر کسی کے صرف دس قدم چلنے کا حال لکھا جائے، تو اون کے ضمن مین اتنے واقعات آجاتے ہین کہ جن کا تفصیل سے لکھنا تو درکنار اون کی فہرست تک نہین بنائی جاسکتی۔ ایک عمدہ افسانہ نگار کا کام یہ ہے کہ وہ اون مین سے صرف ضروری باتین انتخاب کرکے درج قصہ کر دے۔ بقیہ کو نظر انداز کر دے۔

میر صاحب نے اپنی ہر مثنوی مین یہی کیا ہے۔ بلکہ اس انتخاب کے بعد انھون نے اون واقعات کی اہمیت کے اعتبار سے اون مین مدارج بھی قائم کئے ہین اور جو واقعہ جتنا اہم ہے اوسے اوتنی ہی تفصیل کے ساتھہ درج کیا ہے۔ اس بات کا اندازہ میر صاحب کی

ہر مثنوی کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔

اختصار واقعات موقع اور محل سے کسی طولانی واقعہ کو مختصر بیان کرنا ہی بہت بڑا حسن بیان سمجھا جاتا ہے۔ جیسے فردوسی ایک یودی مجلس شورہ کے منعقد ہونے اور ختم ہو جانے کو اس طرح بیان کرتا ہے ؎

بگفتند تا مجلس آراستند
نشستند و گفتند و برخاستند
فردوسی

چونکہ اس مجلس میں کوئی ایسی خاص گفتگو نہیں ہوئی جس کا پلاٹ پر خاص اثر پڑتا ہو۔ لہذا اسے اتنے اختصار سے بیان کر دیا گیا۔

میر صاحب نے اپنی مثنویوں میں جا بجا یہی کیا ہے۔ "مثنوی دریائے عشق" میں نظارہ اول کے وقت عاشق کی بیتابی کا ذکر کرتے ہوئے محبوبہ کی حالت صرف دو شعروں میں اسطرح بیان کی ہے ؎

وہ تو نہیں نہ تھی خیال اس کا　　بے طرح ہوئے گو کہ حال اس کا
پھاڑ دامن کے تئیں صد پارہ
اٹھ گئی سامنے سے اک بارہ

ایک معصوم عورت کے جذبات دلی کو کتنے اجمال و اختصار سے کہہ دیا۔

اسی طرح ایک دوسری مثنوی میں افغان پسر کے عاشق ہونے کے بعد عشق کے ابتدائی ایام کا حال صرف دو مصرعوں میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

کیا چند شرم و حیا ہی کا پاس　　لگے دونوں رہنے گھر دیکھیں اور اس

کے بعد دوسری سلسلہ جنبانی شروع ہوتی ہے۔

انہی اختصار کلام کے سینکڑوں نمونے میر صاحب کی مثنویوں میں مل سکتے ہیں۔

میر صاحب کے ان گوناگون اشعار کو پڑھکر ہر شخص اس بات کا اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کتنے قادر البیان شاعر تھے۔ چند شعر ہیں لیکن ان میں خوف۔ محزونیت۔ شادابی۔ ظرافت۔ غرض سبھی کچھہ موجود ہے۔

اسی طرح اون کی ہر مثنوی سے لطف قدرت بیان حاصل ہو سکتا ہے۔

نتائج مشرقی مثنوی نگاروں کا دستور ہے کہ قصے کے اختتام پر شاعر اس قصہ کا نتیجہ بھی اپنے الفاظ میں لکھدیتا ہے تاکہ پڑھنے والے کو بلا کاوش دماغی کے یہہ بات معلوم ہو جائے کہ اس کہانی کے مطالعہ سے کیا سبق ملتا ہے۔ میر صاحب نے بھی جا بجا ایسا ہی کیا ہے۔ چنانچہ مثنوی "دریائے عشق" کے اختتام پر کہتے ہیں ؎

میر اب شاعری کو کر موقوف	عشق ہے اک فسانۂ معروف
قدرت اپنی جہاں دکھاتا ہے	اس سے جو تو کہے سو آتا ہے
کتنی وسعت ترے بیان میں ہے	کتنی طاقت تری زبان میں ہے

بس ہے اب چُپ خاموشی بہتر
یاں سخن کی فراموشی بہتر

یہاں تک تو عام مثنوی گوئی سے بحث کی گئی۔ اب کچھہ مزید باتیں جو میر صاحب کی مثنویوں میں ملتی ہیں درج ذیل کی جاتی ہیں۔

حمد مشرقی شعرا برکت کے لئے اپنے مثنویوں کے شروع میں اکثر حمد و نعت و منقبت بھی لکھتے ہیں جو اصل واقعہ سے بالکل الگ ہیں۔ میر صاحب نے بھی جا بجا اپنی مثنویوں میں ایسا ہی کیا ہے۔

نمونۃً ملاحظہ ہو۔

ہے قابل حمد وہ سرافراز　　جو سب میں ہو اسے جلوہ پرواز
وہ مست شراب ناز ہے فرد　　خورشید اسی کا جام پر درد
ہے گردش چشم اس کی افزوں　　پھر جائے ہے اس کے ہاتھ گردوں
عالم ہے خرابۂ مے جام　　ہے دور سپہر گردش جام

وہ مست نیاز ہے حرم میں
وہ رفتہ ناز ہے صنم میں

یہ حمد یہ پرکیف اشعار اعلیٰ ترین شاعری کا نمونہ ہیں۔ اسی طرح ایک دوسری مثنوی کا آغاز کرتے ہوئے عشق کا فلسفہ بیان کرتے ہیں اور اس میں حمد و نعت سب کچھ کر لیتے ہیں ؎

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق　　حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشق تھا جو رسول ہو آیا　　اون نے پیغام عشق پہونچایا
عشق حق ہے کہیں نبی ہے کہیں　　ہے محمد کہیں علی ہے کہیں
عشق عالی جناب رکھتا ہے　　جبرئیل و کتاب رکھتا ہے

عشق حاضر ہے عشق غائب ہے
عشق ہی مظہر العجائب ہے

ساقی نامہ مشرقی شعرا اکثر واقعات کے شروع میں کچھ ساقی سے بھی خطاب کر لیتے ہیں تاکہ بیان میں ایک کیف پیدا ہو جائے۔ میر صاحب کے بھی بہت سے ساقی نامے ہیں۔ یہاں تک کہ پوری پوری مثنویاں اسی موضوع پر کہہ ڈالی ہیں۔ میں ذیل میں چند اشعار ایک ساقی نامے کے پیش کرتا ہوں۔

چھو صرف شراب کاش ساقی — یہ شیشۂ عمر جو ہے باقی
بے ساغر ہے تنگ ہے جینا — رکھتا ہے شگون شراب پینا
یاں پیتے ہیں جام بے خودی کا — ہے دور تمام بے خودی کا
پہنچے ہیں فنا کو بے خودی سے — پاتے ہیں خدا کو بیخودی سے
پیا جرعہ و ہوش کو دعا کہہ — ہر بادہ فروش کو دعا کہہ
مستی کی مجھے بھی خواہشیں ہیں — اس عقل سے دل کو کاہشیں ہیں
شیشہ مرے منہ سے تو لگا دے — کر ایسی نگاہ جو چھکا دے

علیحدہ بھی اعلیٰ سے اعلیٰ ساقی نامہ کی مثالیں میر صاحب کی مثنویوں میں ملیں گی۔

مناجات | اکثر مشرقی شعرا حمد و نعت و منقبت کے سلسلہ میں یا کسی اور مقام پر مناجاتیں بھی کہتے رہے ہیں۔ میر صاحب نے بھی اس شعبہ میں زور طبیعت دکھایا ہے۔ مثنوی اعجاز عشق سے ایک مناجات مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے جو تاثرات قلبی کا بہترین نمونہ ہے ؎

مرا زخم یارب نمایاں رہے — پس از مرگ صد سال خنداں رہے
رہے دشمنی جیب سے چاک کو — صبا دوست رکھے مری خاک کو
مژہ اشک خونی سے سازش کرے — غم دل بھی مجھ پر نوازش کرے
جگر سے تپیدن موافق رہے — مرا درد دل مجھ پہ عاشق رہے
خموشی سے ہونٹھ رہے گفتگو — لہو منہ پہ لگا کر مرا رنگ رو
نہ مرہم سے افسردہ ہو داغ دل — شگفتہ رہے پھول کی باغ دل
کریں دونوں عالم ملامت مجھے — ڈبو دیوے اشک ندامت مجھے
جنوں میرے سر پر سلامت رہے — بیاباں میں مجھ سے قیامت رہے

میر صاحب کی رباعیاں

رباعی چند مخصوص بحروں میں چار مقفا اور بامعنی مصرعوں کو کہتے ہیں۔
فنی حیثیت سے شاعر کو اس کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو تیسرے مصرعہ کا قافیہ مختلف کر دے۔ رائج الوقت رباعیوں میں بالعموم یہی آخر الذکر صورت پائی جاتی ہے۔
رباعیات کبھی تسلسل سے نہیں کہی جاتیں بلکہ چار چار مصرعہ مختلف خیالات کے حامل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رباعی کے حسن و قبح وہی ہیں جو غزل کی سرخی کے تحت میں درج ہو چکے ہیں۔ کیونکہ غزل کے خیالات بھی پاشان ہوتے ہیں۔
رباعی میں مزید بات یہ ہے کہ اس کا لہجہ نسبتاً زیادہ وزنی ہونا چاہیے کیونکہ اسکا خاص عنصر فلسفہ، حکمت وغیرہ ہیں عاشقانہ خیالات بھی رباعیوں میں کہے جاتے ہیں لیکن ان کا انداز غزل کے مقابلہ میں زیادہ عمیق ہونا چاہیے۔
میر صاحب نے بھی بہت سی رباعیاں کہی ہیں جن میں بہترین طریقہ پر داد شاعری دی ہے۔ مشتے از خروارے پیش ہیں۔

حقیقی عبادت کا فلسفہ ؎

ہر چند کہ طاعت میں ہوا ہے تو پیر | پر بات مری سن کہ نہیں بے تاثیر
تسبیح بکف پھرنے سے کیا کام چلے | منکے کی طرح دل نہ پھرے جب تک میر

یہی مضمون ایک ہندی شاعر نے یوں کہا ہے ؎

मनका फेरत जुग भया गया न मन का फेर।
कर का मनका डाँड दे, मन का मनका फेर॥

لفظی مطلب ہے۔ تسبیح پھیرتے عمر گذر گئی لیکن دل کا پھیر نہ گیا۔ ہاتھ کا مالا پھینک دے اب دل کا مالا پھیر۔

ل گناہ کی ترغیب کا نیا انداز ؎

مستی نہ کر اے میرؔ اگر ہے ادراک | داماں بلند ابر منظر رکھ تو پاک
ہے عاریتی جامۂ ہستی تیرا | ہوشیار کہ اسیر نہ پڑے گرد و خاک | میرؔ

یک روزے اور نماز کو حل مشکلات کا ذریعہ جانتے ہیں۔ میرؔ صاحب اس
دعرضانہ عبادت پر عجیب انداز سے روشنی ڈالتے ہیں ؎

اب صوم و صلواۃ سے جی ہے بیزار | اب درود و وظائف سے کیا استغفار
عقدے نہ کھلے دل کے بسان تسبیح | اسمائے الٰہی بھی پڑھے سو سو بار! | میرؔ

ہ کی تصویر اور مصور کا کمزور قلم۔ استغفر اللہ ؎

اغلب ہے وہ غم کا بار کھینچے گا میرؔ | منہہ دیکھو کہ شکل یار کھینچے گا میرؔ
بیٹھا ہے بنانے اوس کی چشم میگون | نقاش بہت خمار کھینچے گا میرؔ | میرؔ

ہاری جی نے بھی اس مضمون کو کہا ہے ؎

लिखन बैठ जाकी सबिह गहि गहि गरब गरूर
चतुर चितेरे जगत के भए न केते कूर ॥

ا حملہ۔ اس کی تصویر بڑے بڑے مغرور مصور کھینچنے بیٹھے لیکن وہ سب بیوقوف بنکر
ہ گئے (یعنی اپنے ارادوں میں ناکام رہے)

رخیام تو کہتا ہے کہ ؎

در عالم جاں بہوش می باید بود | در کار جہاں خموش می باید بود
تا چشم و زبان گوش بر جا باشد | بے چشم و زبان گوش می باید بود | عمر خیام

ین میرؔ صاحب اس کے بالکل برعکس سبق دیتے ہیں ؎

چپکے رہنا نہ میرؔ دل میں ٹھانو | پو لو چالیں کہا ہمارا مانو!
اک حرف نہ کہہ سکوگے وقت رفتن | چلنے کو زبان کے غنیمت جانو! | میرؔ

لیکن پھر خموشی کی بھی تعریف کرتے ہیں ؎

ملئے اس شخص سے جو آدم ہووے ۔ ناز اسے کمال پر اور کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے اک خلق ۔ خاموش رہے تو ایک عالم ہووے ۔ میر

حدیث ـ موتوا قبل ان تموتوا کی شرح ـ

.... کہ اب فکر امیری کرلے ۔ بن آئے تو اندیشہ پیری کرلے
آگے مرنے سے خاک ہوجو اے میر ۔ یعنی کہ کوئی روز فقیری کرلے ۔ میر

یہاں بھی وہی خصوصیت محاکات ؎

شب ابر کہ پیش رو ہو دریا جسکا ۔ آیا دل داغ کر گیا جس جس کا
اس سے ناگاہ اک بجلی چمکی ۔ کیا جانے اس نے گھر جلایا کس کا ۔ میر

شاعرانہ سادہ ؎

مسجد میں تو شیخ کو خروشاں دیکھا ۔ میخانہ میں جوش بادہ نوشاں دیکھا
اک گوشۂ عافیت جہاں میں ہم نے ۔ دیکھا تو محلۂ خموشاں دیکھا

بے مثل کنایہ ؎

دامن عزلت کا اب لیا ہے میں نے ۔ دل ہر گ سے آشنا کیا ہے میں نے
تھا چشمۂ آب زندگانی نزدیک ۔ پہ منہ خاک سے اسکو بھر دیا ہے میں نے ۔ میر

عمر خیام کا رنگ ؎

اے تازہ نہال عاشقاں پامالی ۔ پر تو نے طرح ناز کی کیسی ڈالی
سب تجھ سے جہاں بھرا ہے لیکن اوپر ۔ دیکھیں ہیں تو جا ہر کہیں تیری خالی ۔ میر

اسی خیال کا دوسرا رخ ؎

ہم تیرے برے اتنے وہ اتنا ہی خوب ۔ مشترک جہاں ہم ہیں وہ سب کا محبوب
ہم ممکن اسے وجوب کا رتبہ حاصل ۔ ہے کچھ بھی مناسبت کا باہم اسلوب ۔ میر

وجود کیلئے ورڈس ورتھ (Wordsworth) کہتا ہے۔

Our herth is but a sleep and forgetting.

ترجمہ:۔ ہمارا وجود ایک فراموش ہو جانے والا خواب ہے۔

یہی میر صاحب بھی کہتے ہیں ؂

کچھ خواب سی ہے میر یہ صحبت داری — اٹھ جائیں گے یہ بیٹھے ہوئے سب یکباری
کیا آنکھوں کو کھولا ہے تنک گوش کو کھول — افسانہ ہے پل مارتے مجلس ساری — میر

دنیا فریب ظاہری عبادت کی مذمت ؂

اللہ کو زاہد جو طلب کرتے ہیں — ظاہر تقوے کو کس سبب کرتے ہیں!
دکھلانے کو لوگوں کے ہے دونوں کی صلاح — بیشتر انجم نماز شب کرتے ہیں!

ایک نیا خیال ؂

دل اوس سے جلے نہ کیونکر میرا بیتاب — ہاں مجھکو توقع ہے کہ لاتا ہے جواب
واں اُن نے شراب پیکے مستی میں میر — کر کھایا ہی نامہ بر کبوتر کے کباب — میر

ایک اور انوکھا مضمون ؂

محشر میں اگر یہ آتش دم ہوگا! — ہنگامہ سب اک لپٹ میں برہم ہوگا
تکلیف بہشت کاش مجھکو نہ کریں — ورنہ وہ باغ بھی جہنم ہوگا — میر

میر صاحب کی ان رباعیوں کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بحیثیت رباعی نگار کے بھی ایک بہترین شاعر تھے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی رباعیوں میں وہ جلا و صیقل نہیں جیسی میر انیس کی رباعیوں میں ہے۔ لیکن پھر بھی اپنی دیگر خصوصیات کی وجہ سے وہ اردو لٹریچر کی بہترین رباعیوں کے مالک ہیں۔

میر صاحب کے سلام اور مراثی

اس میں شک نہیں کہ سلام اور مراثی اردو شاعری کی دقیق ترین صنف ہے۔ لیکن یہ صنف میر صاحب کے عہد تک بالکل برائے نام تھی۔

اس صنف کو باقاعدہ طور پر میر ضمیر نے ایجاد کیا اور میر انیس نے معراج کمال پر پہونچا کر اسے اتنا بلند کر دیا کہ یہ تمام اصناف سخن سے ممتاز ہو گئی۔

میر صاحب کے جو کچھ سلام اور مرثئے ہیں اون پر شاعرانہ نقطۂ نظر سے تنقید کرنا عبث ہے۔ اون کے لئے اتنا ہی کہدینا کافی ہے کہ وہ میر صاحب کے اخلاص مذہبی کا نمونہ ہیں اور ہمارے لئے بزرگون کا تبرک۔ اور بس۔

میر صاحب کے سلام مراثی غالباً اون کی کسی کلیات میں نہیں شائع ہوئے ہیں میں نے آج تک ان کا صرف ایک سلام اور دو مرثئے دیکھے ہیں۔ ایک قلمی مرثیہ تو میرے جد مرحوم حضرت فائق علیہ الرحمۃ ارشد تلامذہ میر انیس کے ذخیرۂ مراثی میں تھا جو اس وقت مجھے بڑی کاوش پر بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ باقی ایک سلام اور ایک مرثیہ کلیات سودا میں ہے (جو سودا کی ایک تنقیدی نظم کے سلسلے میں نقل کیا گیا ہے)

مجھے اس وقت ٹھیک یاد نہیں آتا مگر کسی مضمون نگار نے میر صاحب کے مراثی اور سلاموں کی ایک طولانی فہرست غالباً کسی مستند قلمی کتاب کے حوالے سے کسی رسالہ میں درج کی ہے۔ نہ معلوم وہ کون سی کتاب ہے اور کون مضمون نگار صاحب ہیں۔

بہر حال میرے خاندان میں جد مرحوم کی برکت سے اس وقت الحمد اللہ مراثی کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے جس کا جواب غالباً ہندوستان میں ایک ہی آدھ جگہ مل سکے گا۔ لیکن پھر بھی

---

[1] میرا مفہوم اصولی مرثیہ نہیں بلکہ حقیقی مرثیہ ہے۔

میں اس وقت میر صاحب کے سوائے اس سلام اور مرثیہ کے جو کلیات سودا میں درج ہے کچھ بھی نہیں پیش کر سکتا۔ یہ اتفاقات ہیں زمانہ کے۔

میر صاحب کا سلام ؎

اے نبی کے باطنا رتبے کے والی السلام — ظاہراں سے بھی ہو تم اک نوع عالی السلام
ہے گریباں گیر گردوں ترے لشکر کا لہو! — تا قیامت کم نہیں ہوتی ہے لالی السلام
اے ہو الاول ہو الآخر کے مالک بالیقین — وے ہو الباطن ہو الظاہر کے والی السلام
یہ شہادت تیری کلمے کی شہادت سے ہے تام — عہد ہو کر بات تمنے ساری پالی السلام
ورنہ تم بے شبہ و شک احمد بے میم ہو
لی مع اللہ کے ہو تم ہر وقت حالی السلام میر

یہ سلام تو کم از کم اصولی طور سے اوسی سلام گوئی سے مطابق ہے جو آجکل رائج ہے ورنہ عہد میر کے اکثر شعراء سلام اس پابستان طریقہ پر (کہ ایک ایک شعر الگ الگ خیال کا حامل ہو) نہیں کہتے تھے بلکہ اون کے سلام مربع مثلث وغیرہ میں بھی ہوا کرتے تھے۔

اسی طرح اوس عہد کے مرثئے بھی آجکل کے مرثیوں کی طرح مسدس کی صورت میں شاذ ہی ہوتے تھے۔ میر صاحب کا مرثیہ ملاحظہ کیجئے جو بصورت مربع ہے ؎

دلوں پہ محبوں کے حالت عجب ہے — مصیبت ہے ماتم ہے غم ہے تعب ہے
غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے — حسین علی کی شہادت کی شب ہے

کوئی دل نہیں جسکو ماتم نہ ہوگا! — وہ دل دیر ہے جس میں یہ غم نہ ہوگا
یہ دن کچھ قیامت سے بھی کم نہ ہوگا — قیامت میں یہ کچھ نہ ہوگا جو اب ہے

ہے چاروں طرف ہو رہا شور محشر   زمیں آسماں ہو رہا ہے تل اوپر
حسین علی پر چلایا ہے خنجر!   ہر اک جان اس غم سے خنجر طلب ہے

اٹھا ہے کہ لو ہو کے دریا بہائے   یہ کشتی فلک کی لہو میں ڈوبائے
شہ تشنہ لب کا کسے غم سنائے   یہ کس منہ سے کہیے کہ وہ خشک لب ہے

سحر تھی کہ خواب عدم اُسکو کہیے   سحر تھی کہ آ حشر کا دم اُسکو کہیے
سحر تھی کہ ظلمات غم اسکو کہیے   کہ اک پرتو اس کا سویدا اُسکی شب ہے

میر

غرض اسی طرح کا سلسلہ چلا گیا ہے جسکو پیش کرنے سے میر صاحب کی شاعرانہ عظمت میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا لہٰذا اس سلسلے کو ختم ہی کر دینا مناسب ہے۔

آجکل میر انیس کی سحر طرازیوں سے مرثیہ گوئی کا جو معیار پیش نظر ہو چکا ہے اس کے اعتبار سے اس مرثیہ کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

میر صاحب کی مختلف نظمیں

اس سرخی کے تحت میں میر صاحب تمام مخمس۔ مسدس۔ مربع۔ مثلث۔ مستزاد ترجیع بند۔ ترکیب بند اور ہفت بند وغیرہ آتے ہیں۔ یہ تمام منظومات چار قسم کے ہیں مذہبی۔ عشقیہ۔ اخلاقی اور ہجویات ہیں۔ ذیل میں اول الذکر تینوں اقسام کا کلام مختلف سرخیوں کے تحت میں درج کیا جاتا ہے۔ آخر الذکر شئے کا ذکر آگے کیا جائے گا۔

مخمس | مخمس ایک ایسی مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کا ہر بند پانچ پانچ مصرعوں کا ہو۔

پہلے بند کے پانچوں مصرعے مقفیٰ ہونا چاہئے۔ اس کے بعد کے بند اس طرح کے ہونا چاہیے کہ
چار مصرعہ تو ایک قافیہ کے ہوں اور آخری مصرعہ اوسی قافیہ کا ہو جو پہلے بند میں کہا گیا ہو
شاعر کو اس کی بھی اجازت ہے کہ وہ ابتداء کے دو ایک بند پہلے بند کے اصول پر کہہ سکتا ہو
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر مخمس کے ہر بند کا آخری مصرع ایک ہو۔
میر صاحب کے ایک پسندیدہ مخمس سے چند بند منقبت حضرت علی علیہ السلام میں ملاحظہ ہوں۔

عشق ہے تو میرا کہا کر تو! — محو یاد علی رہا کر تو!
اس طرح یہ بھی ہے دعا کر تو — اشک رخسار پہ بہا کر تو
یا علی یا علی کہا کر تو

لحظہ لحظہ جدا ہے اوسکی شان — اوس کی عادت مروت و احسان
دوستی اوسکی عین ہے ایمان — جب تلک زبان غنیمت جان
یا علی یا علی کہا کر تو

انسے منظور کام ہے دشوار — ہے یہ وہ ایک جس کے نام ہزار
گرم تسبیح اس کے ہیں ابرار — اللہ اللہ کی جا ہے تو سو بار
یا علی یا علی کہا کر تو

اسم یہ ایک جو مکرم ہے! — سب کے نزدیک اسم اعظم ہے
یہ سبب اور اور پر مقدم ہے — غرض اسے ہم نشیں جو آدم ہے
یا علی یا علی کہا کر تو

خوف محشر سے میں حال ہے کیا — یہ حواسوں کا اختلال ہے کیا
اس سے مخمورہ ملال ہے کیا — ہے علیؑ تو پھر خیال ہے کیا
یا علی یا علی کہا کر تو

مسدس | مسدس ایک ایسی مسلسل نظم کو کہتے ہین کہ جس مین ہر بند مین چھہ چھہ مصرعہ ہون۔ ہر بند کے ابتدائی چار مصرعہ ایک قافیہ کی پابندی سے کہنا چاہئے اور بیت یعنی آخر کے دو مصرعون کے قافیئے الگ ہونا چاہیے۔ مسلسل نظمون کیلیئے میری رائے مین یہ سب سے زیادہ مناسب صنف ہے۔

میسی صاحب کے ایک مسدس کا بھی اقتباس دیکھہ لیجیے ۔

سچ کہو شہر مین صحرا مین کہان رہتے ہو
ہان بہت رہتے ہو خوش باش کہ وان رہتے ہو
ان دونون یارون کی آنکھون سے نہان رہتے ہو
خوش رہو تیر مری جان جہان رہتے ہو
اک طرف بیٹھے ہوئے خون جگر پیتے ہین
عشق کی جان کو دیتے ہین دعا جیتے ہین

مدتین گذرین کہ ای شوخ یہ خواری ہے مجھے
تجھہ سے بیرحم ستمگار سے یاری ہے مجھے
روز و شب رد غم و نالہ و زاری ہے مجھے
بلکہ ہر روز کی شب ہجر مین بھاری ہے مجھے
اہل دل جان کے رکھتا ہے مجھے عشق تینگ
کاش کہ دل کے عوض کوئی ملا ہوتا سنگ

عافیت کا نظر آیا نہ ٹک آثار ہمین !!
دل کی بیتابی نے ہر چند رکھا خوار ہمین
حیف صد حیف میسر نہ ہوا یار ہمین !
تیرے کوچے مین کوئی سایۂ دیوار ہمین
تا کہ وان نالہ و فریاد کیا کرتے ہم
اک طرف بیٹھہ کے تجھے یاد کیا کرتے ہم

مت برس خاک پہ عشاق کی ہم کیا کم تھے
حرف وہی روزہ ہجر پہ دیدے ہمارے نم تھے
موج سیلاب پہ آنسو کے گئے عالم تھے
لیکن ایسے ابر کسی عہد مین ہم ہی ہم تھے
عزم کر دینے کا آبادی سے گر اٹھتے تھے
بیٹھہ کر دشت مین طوفان ہی کر اٹھتے تھے

کون تہا یاں کہ مجھے دیکھہ ندامت رکھے　　یا مرے سر پہ نصیحت سے قیامت رکھے
ہمیں صد سال خدا اُنکو سلامت رکھے　　تو نہ ہووے نہ مجھے کرکے ملامت رکھے
ورنہ ابتک تو مری خاک بہی ہو جاتی ہوا
لے گئی ہوتی تبرک کی طرح باد صبا!

یہ تہا میر صاحب کے ایک عاشقانہ مسدس کا نمونہ جو اون کی اوستادی اور شاعرانہ عظمت کو بہت کچہہ بے نقاب کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس پائے کے مسدس عام طور پر اردو شاعری مین ملنا مشکل ہین۔

میر انیس نے جو مخصوص حسن مسدس مین پیدا کئے ہین اگر صرف اونکو تہوڑی دیر کے لئے بہلا دیا جائے تو میر صاحب کے مسدس بہترین قرار دئے جاسکتے ہین۔

انیس کے مسدس مین خاص بات یہ ہے کہ اون مین علاوہ شاعرانہ محاسن کے ہر پہلو سے صفائی کا اتنا خیال رکہا گیا ہے کہ سامع کی طبیعت کہین سے الجہنے نہ پائے مثلاً انیس کے تمام مسدسات مین یہ بات کہین نہ ملے گی کہ بیت بغیر ردیف کے ہو۔ گو بظاہر یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے لیکن صاحب ذوق ہی سمجہہ سکتے ہین کہ بیت سے ردیف کے نکل جانے سے بند کا زور کتنا کم ہو جاتا ہے۔ انیس کے یہان ایک اور اہتمام ہے کہ مصرع سے مصرع اور بند سے بند ترقی کرتا جاتا ہے۔ میر صاحب نے ان باتوں کا خیال نہین کیا ہے۔ کیونکہ اس زمانہ تک مسدس نگاری اتنی شگفتہ نہ ہوئی تہی۔ میر صاحب ہی اس قسم کے مضامین اردو مسدس مین کہنے کے موجد ہین۔

بہرحال باین ہمہ بحیثیت مسدس گو کے بہی میر صاحب ایک بلند پایہ شاعر تہے۔

مربع اور مثلث | ان کے بہی اصول قریب قریب مخمس کی طرح ہین۔

صرف مختلف بات اتنی ہے کہ مربع کے ہر بند میں چار اور مثلث کے بند میں تین ہم وزن مصرعے ہوتے ہیں۔

اب میر صاحب کے مربع اور مثلث ملاحظہ ہوں۔

میر صاحب کی (مربع کی صورت میں) کوئی مکمل نظم ان کے کلیات میں نہیں ملتی۔ البتہ خال خال اساتذہ فارسی کے اشعار پر مصرعے لگا کر انہوں نے مربع تیار کیے ہیں۔ اور وہی اس طرز کے موجد ہیں ؎

نہ اسکندر نہ دارا ہے نہ کسریٰ ہے نہ قیصر ہے ۔۔۔ یہ بیت المال ملک بے وفا بے وارثہ گھر ہے
جہان کہنہ خلقے را بدل داغ ہوس ماند ۔۔۔ بیا ساقی کہ این ویرانہ از بسیار کس ماند

چمن میں دہر کے ہنستا نہ رہ برنگ گل ۔۔۔ کہ صبح شاخ پہ یہ بیت پڑھتے تھے بلبل
درین حدیقہ بہار و خزاں ہم آغوش است ۔۔۔ زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است

اسی طرح میر صاحب کے ایک مثلث کے بھی چند بند ملاحظہ ہوں۔ مثلثوں کی بھی وہی پا شان صورت ہے جو مربعوں کی تھی یعنی یہاں بھی اساتذہ فارس کے مختلف اشعار پر میر صاحب نے مصرعے لگائے ہیں ؎

آئی تھی ملاقات کی راہ دوس سو بے سود ۔۔۔ تا چشم کنم باز شب وصل سحر بود!!
عمر گذران بر سر انصاف نیاید

جہاں سے آئی کہ جانا ہی تجھکو مجھ سے سن ۔۔۔ بکے بگو رعشہ بیان شہر سیر سے کن!
بہ بین کہ گفتش بلا چہ باطل انتہا است

نالہ بلبل غنچہ عشم شمشاد آہ دلفگار ۔۔۔ باغبان جاروب گل خمیازہ وحرف انتظار
ہر کسے چیزے بیادت در گلستان میکند

مستزاد — اس نظم میں ہر مصرعہ کے بعد ایک اور ٹکڑے کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جو اصل مصرعہ سے مربوط ہوتا ہے۔ یہ طریقہ غزل، رباعی، نظم اور مسلسل منظومات غرض ہر صنف میں مختلف طریقوں پر مستعمل ہے۔ میر صاحب نے اس طریقہ کو صرف رباعی میں استعمال کیا ہے۔ نمونتاً ملاحظہ ہوں۔ معشوق کی سنگدلی سے

تا چند غم دل کی حکایت کریئے — ہو ہو کر تنگ سا
کس کس سے شب و روز شکایت کریئے — آتا ہے ننگ
سختی کوئی اے صنم کہاں تک کھینچے — سہتے جی ہیں کر اب
ہوتا ہے ترے دل میں سرایت کرنے — پر تو ہے سنگ
میر

عاشقانہ رنگ میں "خدا ہر جگہ موجود ہے" کی تفصیل سے

کیا کیا آتی ہے اپنے جی میں لیکن — کیا کہیے آہ!
جی ہی میں سر مارئے کب تک تجھ بن — عشق ہے جانکاہ
تو مست گذارہ ہوئے غیروں کی جا — چھپ چھپ کر رات
ہم پھیرتے تسبیح پھریں سارے دن — سبحان اللہ
میر

یہاں بھی وہی لطف اور وہی کیف ہے جو میر صاحب کی رباعیوں کی خصوصیت ہے۔

ترجیع بند اور ترکیب بند — یہ دونوں چیزیں قریب قریب ایک سی ہیں۔ دونوں میں چند اشعار کے بعد ایک شعر ٹیپ کی صورت میں بیت کہی جاتی ہے۔ بس فرق دونوں میں یہ ہے کہ اگر ایک ہی بیت بار بار لائی جائے تو ترجیع بند کہلائے گا۔ اور اگر بیتیں علیحدہ علیحدہ کہی جائیں تو ترکیب بند کہا جائے گا۔ یہ دونوں اقسام آج تک حب بد قومی، اخلاقی اور

فطری نظموں میں برابر رائج ہیں۔
میکش صاحب کا کچھ کلام بھی ان اصناف کے تحت میں ہے جس میں اچھا خاصا کیف شاعری پایا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ترجیع بند

منقبت علی مرتضے علیہ السلام

ہے علیؑ مدعا علیؑ مقصود — وہی مشہود ہے وہی موجود
ہے علیؑ وہ کہ سارے صاحبدل — لیتے نام اس کا بھیجتے ہیں درود
کیا زمیں کیا سپہر کیا مہ و مہر — کی علیؑ کے لئے سبھوں نے نمود
جمع رکھ دل علیؑ سبب ہوگا — کیا ہے اسباب اگر ہوئے مفقود
مصطفےؐ مرتضےؑ خدا ہے ایک — لیک آگاہ راز ہیں معدود
حشر ہوگا علی کے ساتھ اپنا — کیا ہے وہ ان کا ہیں غم بہبود
عندیہ اپنا اپنا ہے اے شیخ — گوش اس کو تو کر اچھل یا کود

ہم علی کو خدا نہیں جانا
پر خدا سے جدا نہیں جانا

نگاہ بے گاہ کر علی جزائی! — ہے علی دانی ہی خدا دانی
فرش راہ علی کر آنکھوں کو — یوں بچھا تو بساط ایمانی
چاہ میں اس کی آپ کو گم کر — کہیں مجھکو ہی ماہ کنعانی
ہے وہی مہر چرخ عرفاں کا — ہے وہی شاہ ظل سبحانی
قامت آرائے کبریا حق کا — چہرہ پرداز نور یزدانی
ہاتھ اس کا وہی خدا کا ہاتھ — بات اس کی کلام ربانی

شوق مفرط سے ہی یہ طرز سخن! گو برا مانے کوئی مردانی

ہم علی کو خدا نہیں جانا
پر خدا سے جدا نہیں جانا

اسی طرح عاشقانہ رنگ میں ایک ترکیب بند بھی ملاحظہ ہو۔

عمر گذری ہو چکا آسودگی کا روزگار
رنج و محنت کے تئیں آرام سے ہے ننگ و عار

معرکہ ہے یک طرف دونوں ہوئی ہیں سامنے
زخم دل کی یہ ہنسی وہ گریہ بے اختیار

عاشقی جب میں نے کی تھی تب نہیں یہ خوار تھا
کیا کہوں کیا کیا دکھاتا ہے مجھے اب ہجر یار

سینہ دیکھو پھاڑ کے منہ ناخن سے سب نوچا ہوا
آنکھیں دیکھو ڈوبی خون میں جیو کو دیکھو بیقرار

اے کہ گفتی عشق را درمان ہجران کردہ اند
کاش می گفتی کہ ہجران را چہ درمان کردہ اند

بے نیٹ اک آن میں وحشت سی یہ سارا جہان
خاک اڑا پھر ایک دم میں کاروان در کاروان

تیرہ کر عالم کو رہ سرمایہ گرد و غبار!!
چشم مار دشت تو پھر آوارہ کون و مکان

لیکن اتنا ہی پھر آشفتہ نہ ہو جانا کہیں
پیشتر رکھتے ہیں ساری خاطر واماندگان

سو خدا نہ کردہ ہم کہتے نہیں اس راہ سے
کوئی دم وقفہ کرے یا دیر ہوئے جھکو یہاں

یک قدم اے گرد باد دامن صحرا بلیت
در قفا ماندہ است مشت خاک ما تنہا بلیت

گرچہ ہجران میں ترے جاتا تھا میرا جی چلا!
پر یہ تھا دل میں کہ شاید ہوئے تو داد فنا

وصل خاطر خواہ تو معلوم تھا میرے تئیں
آس دلکو لگ رہی تھی جب تلک تھا میں جدا

ایک ساعت پاس بیٹھے درد دل میرا سنے
کرکے غمخواری کہے تیرے تئیں کیا ہو گیا

سو تو یہ سب ہو چکا ہے کاشکہ ملتا نہ تو
ایسے آجانے کا تیرے کون یاں مشتاق تھا

آمدی و حسرت وصل از دلم بر داشتی!
حسرت بود از وصال آن ہم بمن نگذاشتی

ہیں خرابے آج جتنے کل تھے یہ لوگوں کے گھر
مت بنائے خانہ میں منعم رہا کر اسقدر

طاق کسریٰ تو سنا ہوگا کہ کیسا تھا محل ؟
اب کہیں اس طاق کا کسریٰ کے پیدا ہے اثر

حظ باطل سے لکھا ہے صفحۂ کون و مکان
کیوں دماغ اتنا چلا آتا ہے رستے ہی تو گدھر

کیسے کیسے شان والے خاک میں یاں مل گئے
جائے عبرت ہے یہ معمورۂ جہاں کا بے خبر

ہر کجا افتادہ بینی خشت در ویرانہ !
ہست فرد دفتر احوال صاحب خانہ
میر

میرے خیال میں میر صاحب کا یہ ترجیع بند اس پایہ کا ہے جو اپنے رنگ میں آج بھی بے مثل ہے۔

ہفت بند | یہ ترکیب بند کی ایک صورت کا مجازی نام ہے جس میں صرف منقبت حضرت علی علیہ السلام کیجاتی ہے!

فارسی اور اردو میں اس وقت جتنے ہفت بند موجود ہیں ان میں سب سے زیادہ نمایاں ہفت بند ملا کاشی علیہ الرحمۃ کا ہے کہ جس کے جواب اور تقلید میں بیسیوں شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ چنانچہ میر صاحب نے بھی ایک ہفت بند کہا ہے۔ میں یہ تو کہہ نہیں سکتا کہ یہ ہفت بند ملا کاشی کے ہفت بند کے برابر ہے۔ لیکن یہاں اردو کے ہفت بندوں میں اس کا وہی مرتبہ ہے جو فارسی ہفت بندوں میں ہفت بند ملا کاشی کا ہے۔ نمونتاً ملاحظہ ہو ؎

السلام اے مراد دار دار جان آفریں
السلام اے لامکاں کے حاکم مسند نشیں

یہ شرف ہے یہ سیادت یہ تقدس یہ کمال!
یہ تنزہ یہ تجلی یہ تفوق ہے کہیں

تو ولی ہے تو وصی ہے تو علی ہے تو وہی!
جس سے بالاتر تصور کیجئے تو کچھ نہیں

کیا تعقل کیا تبحر کیا تحمل کیا وقار
طفل مکتب ہیں کہاں کا تیرے عقل اولیں

پیشوائے پیشوایاں سجدہ گاہ مومناں — زینت بطحا و یثرب رونق اسلام و دین
مصدر صدہا عجائب ممبع لطف و کرم — زیب منبر جانشین رحمۃ اللعالمین
مقصد دل آشنایان مدعائے عاشقاں — آرزوئے اہل عرفاں مطلب اہل یقین
وارث دین داور عادل شفیع روز حشر — حافظ عرش برین و حامی شرع مبین
مالک ملک ولایت حاکم عالم پسند! — بادشاہ صاحب استقلال امیر المومنین

عہد تیرا عدل ہے سب ملک تیرا ہی سرور
مجرم اندوہ گیں ہوں ملطفت ہو تا فرود
میر

میر صاحب کی ظرافت

عام طرح سے لوگ ظرافت (HUMOUR) کو نہایت آسان سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لٹریچر کا ایک دقیق ترین شعبہ ہے جس میں طبع آزمائی کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ حدود شعری اور ادبیت کو باقی رکھتے ہوئے ظرافت کا نباہنا نہایت اہم اور مشکل بات ہے۔

ظرافت صرف کسی کو ہنسا دینے کا نام نہیں۔ ایک شخص اگر برہنہ ہو کر کسی عام مقام پر ناچنے لگے تو ایک دنیا اس کو دیکھ کر قہقہے لگائے گی۔ لیکن اس کے اس فعل کو کوئی ذی فہم حقیقی ظرافت کے نام سے تعبیر نہیں کر سکتا۔ میرے نزدیک ظرافت ایک جذبۂ حالیہ ہے جو محض اعلی النفوس پر وحی کی صورت میں طاری ہوتا ہے لیکن ہر شخص اس دولت سرمدی سے مالامال نہیں۔ یہ تو ایک عطیہ فطرت ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

شعریت پیدا کرنے کے سامان سے دنیا پر ہے۔ عالم موجودات کا ذرہ ذرہ نگارخانہ شاعری کا ایک آئینہ ہے جس میں شاہد شعریت کبھی خندہ بلب اور کبھی مسکراتی نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظارے کسی نہ کسی صورت میں جذبۂ شعری کو حرکت دیتے ہیں۔ لیکن جلوہ گاہ عالم میں شاہد ظرافت اپنے چہرے پر ایک ایسا دبیز نقاب ڈالے ہوئے ہے کہ اوسے دیکھنے کے لئے خاص قسم کی نظریں درکار ہیں۔

پھولوں کا کھلنا، بلبلوں کا چہچہانا، کوئلوں کی کوک، پپیہوں کا شور، کالی گھٹا، لیلیٰ کی مستانہ چال، غرض یہ سب سامان ایسا ہے جس سے جذبۂ شاعرانہ میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن عام نظروں کو ایسا کوئی سامان نظر نہیں آتا جس سے جذبۂ ظرافت متحرک ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ظرافت نما سامان کا وجود ہے اور ضرور ہے۔ لیکن وہ صرف بلند نفس انسانوں کے قلوب میں موجود رہتا ہے جسے خاص نظریں ہی دیکھ سکتی ہیں۔

ظرافت کے بے پایاں سمندر میں ترنگیں محسوسات کی کشمکش سے نہیں اٹھتیں بلکہ وہ اکثر قطع علائق کی پرسکون فضاؤں میں سطح بحر پر ہی کھیلتی نظر آتی ہیں۔ روحانی نکتہ نظر سے وہ مستقل گدگدی جو اطمینان نفس سے قلب انسانی میں پیدا ہوتی ہے ظرافت کی جڑ ہے۔

ظرافت دو طرح کی ہوتی ہے۔ نثر اور نظم جن میں سے یوں تو دونوں قسمیں اپنی اپنی جگہ بہت مشکل ہیں لیکن آخر الذکر قسم میں خصوصیت سے اشکال ہے۔ نثر میں کسی احمق کے واقعات بیان کرکے یا عبارت کے گھماؤ سے ضرورت ظرافت کی تکمیل کسی حد تک آسان ہے لیکن نظم میں محاسن شعری کو نباہتے ہوئے جب تک آمد کے ساتھ جدت طرازی نہ ہو ظرافت کسی طرح مطبوع نہیں ہو سکتی۔

دنیا کی مختلف زبانوں میں شاعر تو بہت ملیں گے لیکن ایسے شاعر جنہوں نے ظرافت میں مقبولیت حاصل کی ہو بہت کم پائے جائیں گے۔

ظریف شعرا ایک تو تعداد میں بہت کم ہیں پھر ان میں بھی زیادہ تر جو فحش
کو ظرافت سمجھ کر اوسی کے ہو رہے۔ باقی میں اکثریت ایسی ہے جس نے یہ طے کر لیا کہ ہم
جو کچھ کہیں گے وہ یا تو کھانے پینے سے متعلق ہوگا (جیسے اطعمہ) یا اشیاء غلیظ سے متعلق
ہوگا (جیسے چرکین) یا عورتوں کی گفتگو ہوگی۔ (جیسے جان صاحب) حالانکہ حقیقتاً یہ
تمام چیزیں خرافات محض ہیں جن کو ظرافت سے کوئی تعلق نہیں۔ غرضکہ کٹ چھٹ کر
ان شعرا کی تعداد انشا، ذوق، اطعمہ وغیرہ کے برابر پہونچ جاتی ہے۔
مختلف السنہ کو دیکھتے ہوئے میرے خیال میں ظرافت کے لحاظ سے اردو
سب سے زیادہ خوش قسمت ہے جس نے اپنی مختصر عمر میں۔ سودا۔ انشا۔
مشیر۔ اکبر اور ظریف جیسے ظریف شعرا پیدا کر دیئے۔ علی الخصوص
ان میں اکبر کا تو وہ مرتبہ ہے کہ دنیا کی کوئی زبان اس وقت تک اس انداز اور اس
رنگ کا ظریف شاعر نہ پیدا کر سکی۔

اردو میں بہترین ظرافت ہونے کا راز بہت کچھ اس کی تشکیل اور ساخت میں
مضمر ہے۔ اردو محاورات کی تراش و خراش ہی کچھ ایسی ہے جس سے ظرافت کی
دنیا میں بہت کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ مہذب طریقہ پر کسی کو بیوقوف بنانا۔
پھبتی کسنا۔ فقرہ جمانا وغیرہ۔ یہ تمام باتیں جو جان ظرافت ہیں۔ اردو دانی
ادنیٰ طبقے میں اتنی ملیں گی کہ دوسری زبان کے اعلیٰ طبقے میں نہیں مل سکتیں۔

میر صاحب میں بھی ایک صاحب حال ہونے کی حیثیت سے ظرافت کا عنصر
خاصہ موجود ہے۔ گو ان کو اپنی ظریف شاعری پر مطلق زعم نہ تھا نہ انہوں نے اس طرف
کوئی خاص توجہ کی لیکن پھر بھی کچھ ضرورتاً یا مجبوراً اور کچھ قدرتاً ان میں ظرافت کی
چاشنی موجود ہے۔

میر صاحب کی ظرافت دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ (۱) خالص ہجویات (۲) ظرافت
بسلسلہ لطف بیان۔

ہجویات ہجویات دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ ہجو جو ذاتی تکلیف سے غضبناک ہو کر کہی جائے۔ دوسری وہ ہجو جو محض ظرافت کے لئے کہی جائے۔

اول الذکر ہجو میں حقیقی ظرافت باقی رہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب قدرتاً آدمی کو غصہ آجاتا ہے تو اس میں SENSE OF HUMOUR یا شعور ظرافت باقی نہیں رہتا جس کے بعد ظاہر ہے کہ اوس کے بیان میں ظرافت کہاں سے آئے گی۔ ہاں آخر الذکر ہجو البتہ ایسی ہوتی ہے جس میں ظرافت پوری طرح موجود رہتی ہے۔

میر صاحب کی ہجویات اول تو اون کے غضب کا نمونہ ہیں جس میں حقیقی ظرافت شاذ ہی ملتی ہے۔ دوسرے تعداد میں بھی بہت کم ہیں۔ کیونکہ وہ حتی الوسع اس سے پرہیز کرتے تھے جیسا کہ وہ خود ایک ہجو کے شروع میں کہتے ہیں ؎

سنو اے اہل سخن بعد از سلام
چھیڑتا ہے مجھ کو اک تخم حرام

پر نہیں مرغی کا گرم طیر ہے!!
دہسم میں شہباز کا سم سیر ہے

شاعری کو میری ہو گئے جاتے
تم جیتا تجھے مجھ کو سب ہو جاتے

میں ہمیشہ سے رہا ہوں باوقار
کتنے دنوں بہتا ہجو کا کرنا شعار

گر کہوں نے کچھ کہا میں چپ رہا
ہجو اس کی ہو گئی اس کا کہا!

کیا ہوا اگر چاند پر پھینکے ہیں خاک
پڑتی ہے ان سب کے منہ پہ میں ہو پاک

ریوش بد کچھ نہیں میرا اگتا ہے!
مدعی بے ہیچ ہے بس روسیاہ

تھا تحمل مجھ کو میں درویش تھا
دردمند و عاشق و دل ریش تھا!

پر کروں کیا لاعلاجی سی ہے اب
غصہ کے مارے چڑھی ہے مجھ کو تپ

ایسے کتنے ہیں جو اب شاعر بنے
مارتوں یہ لونڈے آئے مجھ سے کہنے!

سارے عالم میں ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا
میر

بہرحال ان تھوڑی بہت ہجویات میں جہاں ان کے دماغ سے غصہ کی گرمی دور ہوئی ہے تو داد ظرافت بھی خوب دی ہے۔ چند مقامات مختلف ہجویات کے ملاحظہ ہوں۔ (ایک شخص کا ہیولیٰ بیان کرتے ہیں) ؎

ہیئت اس کی مضحکہ ہے سوانگ ہے — جیسے اوج ابن عنق کی ٹانگ ہے
سر کے تئیں اوسکے جو دیکھوں کر نگاہ — بانس پر اک وندھی ہانڈی ہو سیاہ
تیرہ رو مضحک سراپا نور ہے — دم اگر ہووے تو پھر لنگور ہے
بیٹھے تو بیٹھا ہے گویا بوریا مار — آتے جاتے جا وپن اوسکو جوتی مار
چال جب چلنے لگے منہہ پھاڑ کر — پاؤں کو پیچھے رکھے منہہ پھاڑ کر
بال ویر رکھتا نہیں ہے پا و سر — ورنہ یہ بھی تھا عجائب جانور
ایک دن بیٹھے تھے یاں ذات شریف — وارد اس دن ہو گئے کتنے ظریف
ایک بولا دیکھکر حیران ہو — یہ جنازہ کا کوئی حیوان ہو
یاں تو ایسا جانور دیکھا نہیں — سر کہیں ہے پاؤں اس کے ہیں کہیں
کیسا عجوبہ کا ہو سکتا ہے یاں — چونچ ہو تو ہے شتر مرغ کلاں
ایک بولا کرکے چشمک میری اور — واہ صاحب جانور پالا ہے زور

ایک دن باہر لوسے کر ہو کھڑے
یہ اچنبھے یوں ہی رہتے ہیں پڑے — میر

گو یہ اشعار محض تفنن ہیں مگر یہاں بھی میر صاحب کی قوت محاکات صنو دے گئی ہے۔

بہرحال میر صاحب کی ہجویات میں جہاں قہر و جلال کا عنصر ہے وہیں خال خال خالص ظرافت کے بھی نمونے ملتے ہیں۔ اب میر صاحب کی وہ ظرافت ملاحظہ کیجئے جو سلسلہ لطف بیان ہے۔

ظرافت بسلسلہ لطفِ بیان

یہ ظرافت میر صاحب کے کسی خاص شعبہ کلام میں نہیں بلکہ اون کی ہر صنف کلام میں
یہ چیز بھی دوسرے کیفیات کے دوش بدوش چل رہی ہے۔ غزل میں بھی وہ
بعض جگہ ظریف شعر کہتے ہیں۔ ایک میخانہ میں کھڑے ہوئے شخص نظر سے شراب
کی مستیاں جذب کر رہے ہیں اور کس مزے سے وہاں کی پر مذاق حالتوں کا
ذکر فرماتے ہیں ؎

مفت آبرو زاہد علامہ لے گیا!
اک مغ بچہ اتار کے عمامہ لے گیا — میر

پھر صبح ہوتے کچھ یاد خدا جو دل میں آتی ہے تو مسجد کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں
وہاں وہی زاہد صاحب (شیخ مسجد) جن کا جامہ شب کو میر صاحب کے سامنے
لٹ چکا تھا ہر سینہ نظر آتے ہیں۔ میر صاحب کی شاعرانہ طبیعت بھلا اتنے دلچسپ
واقعہ کا اخفا کیونکر کرسکتی تھی۔ فوراً بول اٹھے ؎

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانے میں
جبہ خرقہ کرتا ٹوپی مستی میں انعام کیا! — میر

قصیدے جیسی صنف میں بھی مذاق سے نہیں چوکتے۔ ایک جگہ جوشِ بہار
دکھاتے ہوئے شیخ جی کے "حال" کی کیسی مضحک تصویر کھینچتے ہیں ؎

شیخ کے قد کی درازی کے تئیں حال میں دیکھ
یاد آتا ہے جو اونٹوں کے تئیں رقصِ جمل
کود نے کو جو اٹھا سر پہ اٹھالی محفل
دیکھیے بیٹھے جو پھر اونٹ تو بیٹھے کس کل

درازِ قد شیخ جی کے بے تکان رقص حالیہ کی تشبیہ اونٹ کے ناچ سے جو لطفِ ظرافت
پیدا کر رہی ہے اس کا مزا کچھ دل ہی اٹھا سکتا ہے۔
خاص طرح سے زورِ ظرافت انھوں نے اپنی مسلسل مثنویوں میں دکھایا ہے

چنانچہ اپنے ایک سفر کی حالت بیان کرتے ہین۔ ہم سفر کے ساتہہ میر صاحب ایک سرائے مین پہونچتے ہین۔ وہان کی بہٹیاری سے گفتگو سنئے۔ بہٹیاری کی زبان کس خوبصورتی سے بیان کی ہے ~

ڈہونڈتے ڈہونڈتے سرا پائی — جیسے گہر چہوڑے ویسی جا پائی!
رہنا بہٹیاری کے غنیمت جان — جو کہا اون نے سب گئے ہم مان
کچہہ پکانے کا جب سوال کیا — مین نے اظہار اپنا حال کیا
یان جو لائے ہین مجہکو اپنے ساتہہ — زندگانی ہے میری ان کے ہاتہہ
سن کے اک دل سے کہنچی اُن نے آہ — اور بولی کہ واہ صاحب واہ
ہم تو جانا تہا آدمی ہو بڑے — چار پانچ آدمی ہین پاس کہڑے
کچہہ یہ کہاوین گے کچہہ کہلائین گے — ہم کچہہ ان کے سبب سے پائین گے
سو تو نکلے ہو کورے بالم تم — ہو گدا جیسے شاہ عالم تم!
کہانے پینے کی کچہہ نہین ہے بات — دیکہئے کس طرح سے گذرے رات
صدقے مین ایسے بہی اتارے کے — سو گئے بخت گہر ہمارے کے!
مین کہا ہنترانی جی! کچہہ لو! — مجہہ سے آزردہ دل نہ اتنی ہو
بعضے کہاتے ہین کچہہ کہلاتے ہین — بعضے مجہہ سے بہی آتے جاتے ہین

یارے جون تون ہوئی وہ رات تمام
صبح کو صاحبون کو ٹہہرا مقام!
میر

میر صاحب میرٹہہ پہونچتے ہین۔ وہان جو مکان رہنے کو ملا وہ بہت خراب تہا جسمین مچہر پسو اور اسی طرح کی آفتین تہین۔ یہی سب ذکر کرتے ہوئے وہان کے کتون کی ازاط بیان کرتے ہین۔

ہر مقام پر ظرافت کے پیرائے مین داد محاکات دی ہے ~

کتوں کے چار دن اور رستے تھے — کتے ہی واں کہے تو بستے تھے
وہ کہیں ہیں کھڑے کہیں بیٹھے — چار لوگوں کے گھر میں ہیں بیٹھے
ایک نے پھوڑے باسن ایکو نے — کھود مارے گھروں کے سب کونے
کوئی گھورا کرے کوئی بھونکے — خفتہ خفتہ ہی شور سے چونکے
سانجھ ہوتے قیامت آئی ایک — شور عف عف سے آفت آگئی ایک
گلہ گلہ گھروں میں پھرنے لگے — روٹی ٹکڑے کی [illegible] کرنے لگے
ایک نے آکے دیگچہ چاٹا! — ایک آیا تو کہا گیا آٹا!!
گھور نے ایک لگا اندھیرا کر — ایک نے اور ایک پھیرا کر
گھر میں چھینکے اگر تھے توڑ دیے — ہانڈی باسن گرا کے پھوڑ دیے
لوگ سوتے ہیں کتے پھرتے ہیں — لڑتے ہیں دوڑتے ہیں گرتے ہیں
جاگتے ہو تو دو بدو کتے — سو کے اٹھو تو ردہ برد کتے!
منھ میں کف دور دور کرتے سے — حال بے حال شور کرتے سے
باہر اندر کہاں کہاں کتے — بام اور چھت جہاں تہاں کتے
جھڑ جھڑا دے ہی کان کو کوئی — روئے ہی اپنی جان کو کوئی
یک طرف ہے چپڑ چپڑ کی صدا — یعنی کتا ہے چپکی چاٹ رہا
کتے یارو کہ جان کے ہیں روگ — جاں بلب ہوں نہ کس طرح سے لوگ

آدمی کی معاش ہو کیوں کر
میر — کتوں میں بود و باش ہو کیوں کر

غرض اس طرح کی ظرافت کی مسلسل مثالیں کلام میر میں بہت ملیں گی۔ ممکن ہے ادنیٰ قسم کا مذاق رکھنے والے لوگ جو صرف گالی گلوج اور ٹھٹھوں کو پسند کرتے ہیں اس اعلیٰ ظرافت کو پسند نہ کر سکیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ

اعلیٰ ظرافت وہ نہیں جو انسان کو قہقہوں تک پہونچا دے۔ بلکہ اعلیٰ ظرافت صرف وہی ہے
جس سے قلب میں گدگدی سی پیدا ہو یا زیادہ سے زیادہ ہونٹھوں پر ہلکی سی مسکراہٹ
آجائے۔
میرے خیال میں اگر اردو لٹریچر کی ظریف نظموں کا انتخاب کیا جائے تو میر صاحب کے
اس قسم کے اشعار خط جلی میں لکھے جائیں گے۔

کلام میر سے تاریخی معلومات

کسی قوم کی صحیح حالت کا اندازہ کرنے کا بہترین ذریعہ اس کے مستند شعراء کا کلام
ہے۔ ایک حقیقی شاعر کا مجموعہ کلام اپنے عہد کے رسم ورواج۔ طرز معاشرت
اور اسی قسم کی دیگر باتوں کی ہمیشہ زندہ رہنے والی تاریخ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ
سب چیزیں اوس ماحول سے گہرا تعلق رکھتی ہیں جن پر اس کی شاعری کی بنیاد
ہوتی ہے۔
بحیثیت ایک کامل شاعر ہونے کے میر صاحب کے مجموعہ کلام میں بھی یہی بات ہے
جس کے مطالعہ سے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کا ذکر تاریخ میں
نہیں ملتا۔
آجکل کی غلام ساز تاریخیں ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ ہم ہندوستانی ہندو اور مسلمان
بہائم کی طرح ہمیشہ آپس میں لڑا کرتے تھے۔ اگر کسی جگہ کوئی مسلمان بادشاہ ہوتا تھا
تو ہندوؤں کا خون چوستا تھا۔ اور اگر کوئی ہندو برسر حکومت ہوتا تھا
تو مسلمانوں کی گردنیں کاٹتا تھا۔ لیکن کلام میر کے مطالعہ سے اس سازش
کی قلعی پوری طرح کھل جاتی ہے اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کم از کم خلد آشیان
نواب آصف الدولہ کے عہد حکومت میں ہندو اور مسلمانوں میں ایسا ربط وضبط تھا

کہ ایک دوسرے کے تیوہار تک مناتے تھے۔ بلکہ بادشاہ خود بنفس نفیس ہندؤں کے تیوہاروں میں حصہ لیتا تھا اور ان کی انجام دہی میں خزانہ عامرہ سے روپیہ خرچ کرتا تھا۔

مثال کے طور پر میر صاحب کی ایک مثنوی "ھولی" کے کچھ اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ جن سے علاوہ اس حقیقت کے بے نقاب ہونے کے یہ بھی پتہ چلیگا کہ اس زمانہ میں ہولی کس ساز و سامان سے منائی جاتی تھی اور کیا کیا رسوم انجام دئے جاتے تھے۔ اپنے چشم دید واقعات میر صاحب یوں بیان کرتے ہیں ؎

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر ۔۔۔ رنگ صحبت سے عجب ہیں خورد و پیر
شیشہ شیشہ صرف رنگ و دستان ۔۔۔ صحن دولت خانہ رشک بوستان
دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جوان ۔۔۔ جیسے گلدستے جو ڈن پر ہو روان
زعفرانی رنگ سے رنگین لباس ۔۔۔ عطر مالی سے سبھوں میں گل کی باس
رنگ افشانی سے پڑتی تھی پھوار ۔۔۔ رنگ باران تھا مگر ابر بہار
قمقمے جو مارتے بھر کر گلال ۔۔۔ جس کے لگتا آن کر پھر منھ تھی لال

برگ گل ملوان اڑاتے تھے عبیر
تھی ہوا میں گرد تا چرخ اثیر

اس کے بعد شہر کے جشن کی حالت ؎

روشن الدولہ کی تھی وہ روشنی ۔۔۔ کب ہوئی تھی لیکن ایسی روشنی
وہ چراغان گرچہ تھی درگاہ تک ۔۔۔ تھے تماشائی گدا و شاہ تک

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام شہر میں بتقریب ہولی چراغان ہوتا تھا جس میں تمام عمائدین شہر سے لیکر غربا تک حصہ لیتے تھے کیونکہ روشن الدولہ کی کوٹھی اس زمانہ کے لکھنؤ کے ایک کونے پہ اور درگاہ دوسرے کونے پہ تھی:—

پہر فرماتے ہیں ؎

ٹٹیاں دریا کی باندہے دو طرف ‌ ‌ کیا چراغاں آسماں کی ہو طرف
ایک عالم دیکہتا تہا دور سے ‌ ‌ رات دن تہی روشنی کے نور سے
تہا جہاں تک آب دریا کا بہاؤ ‌ ‌ واں تلک تہا اس چراغاں کا دکہاؤ
کوچہ و بازار بام و در بنے! ‌ ‌ روشنی کے دونوں رستے گہر بنے
آئے کیا کیا سوانگ نیکر درمیاں ‌ ‌ دیکہنے کا سوانگ تہا سارا جہاں
آئے کس کس رنگ سے دامن سوار ‌ ‌ باد کے رنگوں جہنوں کا تہا گذار
تا ہتی آئے کوہ پیکر کیا بنے!
جیسے .... جوان ہوا بنے

مندرجہ بالا آخر کے دو شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تیوہار کے منانے میں حکومت کی طرف سے خاص مدد دی جاتی تہی ۔

پہر کہتے ہیں ؎

کیسی کیسی دیکہیں شکل ناز یاں ‌ ‌ سحر کرتے تہے کہ صورت باز یاں
کشتیوں میں جو دیئے بہر کر چلے ‌ ‌ پانی میں شعلے کے ریلے بہہ چلے
منعکس تہے جو چراغاں تہ تلک ‌ ‌ آب کی وسعت تہی ہر تخسم فلک

آتش بازی ؎

کیا ہوائی چہوٹنے کا ہو بیاں! ‌ ‌ ذو ذنب جیسے ستارے ہوں عیاں
ہر دو جانب چھٹ گئے ناری انار ‌ ‌ گل فشانی سے انہوں کی تہی بہار
ماہتاب اک طرف سے جو دغی! ‌ ‌ چاند نکلا ہو گئے حیراں سبہی
آفریں صناع لوگو آفریں ‌ ‌ کیا لگا یا باغ آکر کاغذیں!
گل کترکر پہول گل ہی کر دیئے ‌ ‌ رنگ تازے کا غذوں میں بہر دیئے

چھٹیں تو ہیں ستاروں کی دغیں — لوگوں کی آنکھیں فلک سے جا لگیں
دیکھیاں کیا کیا نہ شعلہ خیزیاں — تھی ہوائیں سے ستارہ ریزیاں
نذر کو نواب کی اہل فرنگ — لے کے آتش بازی آئے رنگ رنگ

یہ جشن اتنا اہم ہوتا تھا کہ غیر ملکی لوگ تک اپنے ملک کی اشیاء نذر کے لئے لاتے تھے۔

داغیاں تو ہیں ہوائی ایک بار — پھیلے تارے آسمان میں بے شمار
رحمت اے آتش زباں کیا لاگ ہے — کہ بساط آب دریا آگ ہے — میر

آج بھی اودھ لکھنؤ میں ہولی منائی جاتی ہے جس کی ایک ہولی کی کیفیت میر صاحب نے بیان کی ہے۔ لیکن جو جشن ایک مسلمان بادشاہ کے عہد حکومت میں ہو گیا اب اس کا عشر عشیر بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔

افسوس اے رواداری تو کہاں چلی گئی۔ آج صرف تیرے نہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان ضلالت کے اندھیرے میں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ ہولی آتی ہے مگر وہ رنگ رلیاں نہیں ہوتیں۔ عید آتی ہے مگر وہ چہل پہل مفقود ہوتی ہے۔ اس کا سبب ایک اور صرف ایک ہے۔ اور وہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ دونوں کے درمیان بغض و عداوت کی ایک دیوار قائم ہو گئی ہے۔ کاش یہ دیوار منہدم ہو اور وہی دور آصفی کا پریم ساگر پھر موجیں مارنے لگے۔

یہ کس سنہ کے جشن ہولی کا ذکر میر صاحب نے کیا ہے اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ ایک دوسری مثنوی اور انہوں نے کہی ہے جس میں کسی دوسرے جشن ہولی کا ذکر کیا ہے اس مثنوی کے اختتام پر انہوں نے حسب عادت ایک غزل بھی شامل کی ہے جس میں اس جشن کی تاریخ اس مصرعہ سے نکالی ہے۔ ؏

ہم نے کبھو نہ دیکھی اس رنگ کتخدائی
۶ ۳ ۲ ۱ ھ

اسی طرح اپنے ایک سفرنامہ کے سلسلہ میں اوس زمانہ کے میرٹھہ کی تصویر کھینچی ہے جس کا مطالعہ تاریخی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

میر صاحب میرٹھہ پہونچتے ہیں۔ ان کی آنکھوں نے جس حالت میں میرٹھہ کو دیکھا وہ سنئے آجکل کے میرٹھہ کو دیکھکر اوس میرٹھہ کا قیاس بھی مشکل ہے۔

وان سے میرٹھہ سبوں کی تھی منزل — کیچ پانی اگرچہ تھا حائل !
گرتے پڑتے پہونچ گئے سارے — ہم جفائے سپہر کے مارے
اک گڑھی بود و باش کو پائی ! — کچھہ نہ کھانے کو جس نے کھائی
پہوٹی پہاٹی سی چاردیواری — اور میدان تھی گڈہی ساری
وہ گڑھی بساری کہیتی ناج کی تھی — برسوں سے تھی پڑی نہ آج کی تھی
خاک مٹی سے ان گڑہوں کو بھرا — بنگلہ اک لاکے اوس کے بیچ دھرا
باد جنگل کی تند کچھہ نہ رکاو ! — مینہ میں چل پڑے تو کاہنے جاو
اک گڑھی جس کی سینکڑوں راہیں — وان ٹھہرنے کو چاہیئے باہیں !
وہ رہے جو رکھے بہت سے لوگ — یاکوئی جوگی جو کرے وان جوگ
یا دسی دن کو سائیں سائیں کرے
رات ہوئے تو بھائیں بھائیں کرے

اس کے بعد میرٹھہ کے عام افلاس کا ذکر کرتے ہیں ؎

گرشکستہ ہوئی کہیں دیوار — بے زری سے بنانا ہی دشوار
کارپردازوں کو تقید ہے — شور ہے گالی ہے تشدد ہے
کہتے ہیں اون سے تو ملے ہی جواب — کس کے گہر سے بنادیں لاکے شتاب
ہم کو کھانے ہی کا تردد ہے — صلیح بقال کا تشدد ہے
جس سے جھوٹے ہوئی ہیں ہم سو بار — چوٹا وہ کہے ہے ساہو کار !

ماش کی دال کا نہ کریئے گلا ۔۔۔ گوشت یاں ہے کبھو کسی کو ملا

میرٹھ میں ترکاریوں کی کمیابی ؎

جی اگر چاہے کوئی ترکاری ۔۔۔ گول کدو ملے بصد خواری!
بھنڈی بینگن کے نام ڈھینڈس تھا ۔۔۔ اروی ترئی بغیر جی بس تھا

میرٹھ کی بستی ؎

بستی دیکھی سو ایسی تھی آباد ۔۔۔ کہ بیابان سخت سے دے یاد
چار چھپر کہیں چماروں کے ۔۔۔ سو بھی ٹوٹے گھرے بچاروں کے
پھر چلو آگے تو نہیں ہے کچھ ۔۔۔ ڈھنڈھ سا ادھو کہیں ہے کچھ
ٹوٹی پھوٹی کوئی حویلی ہے! ۔۔۔ سو بھی میدان میں اکیلی ہے

معلوم ہوتا ہے کہ بہت پرانے زمانہ میں میرٹھ کوئی بڑا شہر تھا۔ لیکن گردش فلکی سے میر صاحب کے زمانہ میں اجڑ گیا تھا۔ ٹوٹی ہوئی پرانی حویلیاں جو میر صاحب نے دیکھیں وہ اس کی قدیم تاریخی صورت کے مٹے ہوئے خط و خال تھے۔

پھر کہتے ہیں ؎

اور دو چار گھر نظر آئے! ۔۔۔ ان کی خوبی کہے وہیں جائے
وہ بھی کوئی چمار رہتے کوئی ۔۔۔ فاقوں سے زیر بار رہتے کوئی
صورتیں کالی اور سوکھی سی! ۔۔۔ ساری کنگال اور بھوکی سی
چار دانوں کے واسطے جی دیں ۔۔۔ جان کہا جاویں کچھ نہ جبتک لیں

میرٹھ کا بازار

اور آگے بڑھے تو تھا بازار ۔۔۔ اوسمیں بنیوں کی تھیں دکانیں چار
ایک کے پاس دال کچھ آٹا ۔۔۔ تسکو بھی مکھیوں نے تھا چاٹا
آیا کچھ ساتوان اور تھوڑے چنے ۔۔۔ جبڑوں میں خاک دھول ایک کنے

جو تہا باقی رہا سو تہا کنگال — نام کو اُسکو کہتے تہے بقال
ایک کنجڑے کے چار تہی پیاز — تسپہ اوسکو ہزار نخرہ و ناز
کیا کہوں مرچ تہی نہ ادرک تہا — اک چھندر میں کچھہ بہی بہدرک تہا
ایک دوکان تہی پساری کی ! — ان نے ہم لوگوں سے بہی یاری کی
اس سے جا کر جو مانگئے ہلدی — زرد مٹی کو باندہ دے جلدی
دیکھہ کر کچھہ کہو تو وہ یہہ کہے — بس تم اس بستی میں میاجی رہے
یاں جو کچھہ ہے چلن وہ دیتا ہوں — میں بہی پیسے لگا کے لیتا ہوں
لونگ جو اک نفر سے منگوایا — لال مرچیں کٹی ہوئی لا یا !

اور اشیا رہیں سے کرنے قیاس
آگے جاتا ہیں تہا مجہہ پاس

بستی کی عام حالت اور معاشرت سے

اور وہیں تہیں گہر گنواروں کے — اور دو چار فاقہ ماروں کے
چہوٹی مسجد خطیب تہا نہ اذان — یہی خانہ خطیب کا تہا و ان !
تہی نہ قید صلوٰۃ و رسم صوم — اس پہ سید امام وان کی قوم
بندے سب جنکا تہا خدا نہ کوئی — اس طریقہ سے آشنا نہ کوئی
راہ و رسم و طریق سب بدتہب — پہلے گالی ہی پیچہے حرف طلب
کوسوں بہاگا اگر ملا کوئی ! — صحبت ایسوں نے رکہے کیا کوئی
ایک تکیہ نہ جسمیں فرش نہ گاہ ! — حال درویش قابل صد آہ
ٹکڑے ٹکڑے کی احتیاج اسکو — مرض جوع لا علاج اوس کو
برسوں جلا کے نا امید ہوا ! — ...... ہے جگر میں چہید ہوا
آتے جاتے سے ان جو پایا ! — اُس ہی میں رہ گیا وہی کہا یا

عقائد سے

گرد جو چار جنات کسے ڈھیر — جن کو کہتے تھے لیٹے ہیں یاں شیر
اپنا تو اعتقاد تھا ہی کم !! — پر کبھو ملی بھی نہ دیکھی ہم

آب و ہوا سے

آس پاس اس گڑھی کے آئی جھیل — گم تھے برسات میں طریق و سبیل
اس سے واں کی ہوا بہت مرطوب — ہوگئے نزلہ زکام بے اسلوب
کتنے زوروں میں ہوئی ہے کھانسی — ایسی جیسے گلے میں دیں پھانسی
پھر وہ درجہ کہ جس میں ہوئے دق — یہ کوئی نکلی ایک ثالث شق !

سکھوں سے خوف سے

بڑی آفت خطر تھا سکھوں کا — کیونکہ وہ ملک گھر تھا سکھوں کا
انمیں آجائے تو قیامت تھی — مال اور جان سب کو رخصت تھی
نہ کوئی داد رس نہ وقت داد — مفت ہی ہم گئے تھے سب برباد   میر

غرض میر صاحب کا کلام اس طرح کی دلچسپ تاریخی معلومات کا ایک ذخیرہ ہے۔ جو اگر یکجا کیا جائے تو ایک مستقل ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ میں نے نمونتاً مشتے از خروارے پیش کر دیا۔ اس کے علاوہ میر صاحب کا کلام خود تاریخ کا ایک پرمعلومات ورق ہے جس کی عبرت اور حزنیت دیکھکر ایک مورخ نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ وہ جس دور کے شاعر ہیں وہ ایک ایسا دور تھا کہ جس میں ہندوستان کی قومی سلطنتیں کچھ تو خانہ جنگیوں کیوجہ سے اور کچھ غیر ملکی لوگوں کی ریشہ دوانیوں سے تباہ ہو رہی تھیں دیسی بادشاہ محض بادشاہ شطرنج کی صورت میں رہ گئے تھے۔ ہرطرف افلاس غربت اور تباہی کا دور تھا۔ خونریزی اپنا رنگ جمائے ہوئے تھی قادر غلام نے شاہ عالم کی آنکھیں نکال لیں۔ یہ دردانگیز اور اہم واقعہ کلام میر میں اسطرح ملتا ہے ؎

سہتیاں کہ کھل جو اہر تھی خاک پا جن کی!
اونھیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

دلّی اجڑی اور اس طرح اجڑی کہ شاہی خاندان کے لوگ بھیک مانگنے نہیں پاتے تھے
اس انقلاب کا مرثیہ میر صاحب اس طرح فرماتے ہیں ؎

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اونھیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا!

میر صاحب کی فارسیت

میر صاحب کی فارسیت دو حصوں میں منقسم کیجا سکتی ہے۔ (۱) نثر (۲) نظم

نثر | میر صاحب کی تصنیفات کے سلسلہ میں بیان ہو چکا ہے کہ نثر میں انکی چار تصنیفات ہیں۔ (۱) **فیض میر** (۲) **دریائے عشق** (۳) **تذکرہ نکات الشعرا** (۴) **ذکر میر**۔ یہ چاروں کتابیں فارسی میں ہیں کیونکہ اس زمانہ تک اردو کا رواج نہ تھا ورنہ شاید میر صاحب بھی یہ کتابیں اردو میں لکھتے۔
اب میں میر صاحب کی اون چاروں تصنیفات پر کسی قدر روشنی ڈال کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ کس پایہ کے منشی تھے۔

فیض میر | یہ ایک غیر مطبوعہ محض درسی رسالہ ہے جس میں پانچ دلچسپ اخلاقی حکایات ایک مخصوص منشیانہ انداز میں درج کی ہیں۔
اس رسالے کو میر صاحب نے اپنے صاحبزادے میر فیض علی کی تعلیمی ضرورت کیلئے لکھا تھا۔ جیسا کہ خود ابتدا میں بیان کرتے ہیں۔

سیاق عبارت اور انداز بیان قابل توجہ ہے وہی مقفٰی اور مسجع طرز جو پرانے اعلیٰ درجہ کے منشیوں کا ہوتا ہے میر صاحب نے بھی اختیار کیا ہے ایک ایک فقرے کی بلاغت آنکے مبلغ علم پہ روشنی ڈال رہی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

ابتدائی عبارت: "بعد حمد و ثنائے قادر سخنے کہ بیک حرف جریدۂ عالم را از قلمرو عدم بر صفحۂ ہستی جلوہ داد، و تجلیات زاکیات اہی کہ آشنا بحرف مفصل نہ بود۔"

اس عبارت کے تلازمے کو ملاحظہ فرمائیے۔ ایک درسی کتاب کی تمہید کتنے مناسب الفاظ میں درج کی ہے اس کے بعد سبب تالیف کتاب اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

"اول بسم اللہ سر بجہان معنی نہاد۔ میگوید فقیر حقیر میر تقی میرؔ کہ در ایں ایام فیض علی پسر من ذوق خواندن پیدا کردہ بودند۔ حکایت خمسہ متضمن فوائد بسیار باندک فرصت نگاشتم و مراعات اسم او نمودہ نام نسخہ "فیض میر" گذاشتم۔ ہر کہ ایں حکایات خمسہ را بدل خواند در رنج و سختی نہ ماند۔"

"باندک فرصت نگاشتم" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب میر صاحب نے بہت جلدی میں قلم برداشتہ لکھی ہے۔

مندرجہ بالا عبارت کے بعد میر صاحب درسی حکایات شروع کرتے ہیں۔ ان حکایات میں سے چار حکایات میں نے اپنے ایک مرحوم دوست کے کتب خانہ میں نہایت بوسیدہ حالت میں دیکھی تھیں۔ میرا قصد تھا کہ انکو کسی وقت نقل کروالوں۔ لیکن مجھے زمانے نے اور مرحوم کو موت فرصت نہ دی کاش آج وہ حکایات میرے پاس ہوتیں تو انکا خاطر خواہ اقتباس اس موقع پہ پیش کرتا۔ ان چار حکایات کے مطالعہ سے جو خیال میرے حافظہ میں باقی رہ گیا وہ یہی ہے کہ ان حکایات میں فلسفۂ اخلاق پہ خاص روشنی ڈالی گئی تھی۔

میر نمبر کے نیرنگستان میں مرحوم اڈیٹر نیرنگ نے ان حکایات میں سے پہلی حکایت کا کچھ اقتباس دیا ہے جسے نقل کئے دیتا ہوں۔

"روزے بادرویشے شاہ شاہاں نام، مستغرق شوق صبح و شام، حالتش برالسنہ مذکور بہ شہر آہو خانہ مشہور، برخودم التفات بسیارے کردو گفت کہ اے جوان درچہ خیالی کہ ایں ہمہ پریشان حالی۔ اگر باآں سراپا نازسرے داری باید کہ بخود نظرے داشتہ باشی بایں ہمہ تنزیہ و تقدیس علاقہ دار کہ اورا از تو فرق نتواں کرد۔ ایں نیست کہ پیدا نیست یا اینجا نیست دانجا نیست ہر چند از کمال ظہور حسن چوں آفتاب نصف النہار در حجاب است، اما کدام ذرہ از ذرات عالم دیدی کہ بے پرتوے آں آفتاب است۔

جدا از خود چہ می جوئی تو ہم کردہ مہجور است
اگر معنی ہمیں معنی اگر صورت ہمیں صورت

مشکیزہ بردوش گرفتہ بہ بازار می آمد و آواز می داد کہ اے خشک دہانان ساحل دریائے کم آب ہستی اگر از شما کسے لب تر کردنی منظور دارد خوش باشد۔ ہرگاہ مرداں بردگرد می آمدند کسے را شربت شکر خام کسے را ترا از شیر جام می داد، ریا کاری نبود آب در شیر نمیکرد، قدم پیش می نہاد۔ یکے پاسے از شب گذشتہ روئے سخن بسوئے من کرد، کہ اے عزیز اگر نان جویں دست دہد ایں پیر ضعیف سیر میخورد۔ چوں برخاستم گفت کجا؟ گفتم موافق ارشاد کار بندی تو نم گفتا برو، اما گمان نہ خواہی برد کہ نان میگیرم دجان می دہم، من سیرم ....

....

نان چوں پیش فقیر بردم گفت ایں نان قابل خوردن آدمی نیست بر آں مادہ سگ عفیفی کردہ است زود از ایں جا بردار و پیش سگاں بانداز۔

خاتمہ کتاب پہ میر صاحب نے عدیم الفرصتی کا بھی عذر کیا ہے۔

"امید از یاران زمان است کہ اگر جائے عیب و خطا ملاحظہ نمایند نظر بر تنگی و کم فرصتی من نمودہ زبان طعن را نکشایند۔"

دریائے عشق یہ میر صاحب کا ایک غیر مطبوعہ افسانہ ہے جسکے متعلق مرحوم ایڈیٹر صاحب

نیرنگ رامپور بیان فرماتے ہیں :-

"اُردو میں میرؔ نے مثنوی دریائے عشق لکھی ہے ....

اس مثنوی میں جو داستان ہے اسکو میر صاحب نے فارسی نثر میں بھی بیان کیا ہے ..... یہ مختصر رسالہ بھی غیر مطبوعہ ہے اس کا ذکر کبھی کسی تذکرہ میں نہیں دیکھا گیا۔ یہ رسالہ ایک قلمی بیاض میں دستیاب ہوا ہے۔" نیرنگ میرؔ نمبر

اسکے بعد اس حکایت کے جو اقتباسات درج کئے ہیں وہ واقعی مثنوی دریائے عشق کی (جسکا ذکر مثنویوں کے سلسلہ میں ہو چکا ہے) فارسی نثر ہے بلکہ بعض جگہ تو معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ عبارت مثنوی کا ترجمہ ہے یا مثنوی اسکا ترجمہ ہے۔ دلچسپی کے لئے مکرر اس قصہ کا اقتباس درج کئے دیتا ہوں :-

تمہید | عشق بے محابہ چند بزرگانرا شور در سر گردید۔ و چہ جوانان را جامہ در خوں کشید دیدی کہ یعقوب چہ دید و بر سر شیخ صنعا چہ رسید۔ یوسف را در زندان بگذاشت و پردہ از روئے کار زلیخا برداشت۔

اسکے بعد آغاز داستان کرتے ہیں۔

"در شہرے باہر وئے بود جوانِ رعنا۔ در خوبصورتی و تناسب اعضا یکتا، گل بود و گل پیراہن افزائندۂ رشک چمن بخوبی و خوش اسلوبی آراستہ چوں سرو سہی نوخواستہ۔ خوش چشم، قامت بلندے، معشوق عالم پسندے۔ رنگین خرام رنگین ادا۔ بہار جلوہ نما۔ نرگس جہانی لعلش عنابی طرز نگاہ دلہا کشیدے، جنبش مژگاں بجاں خلیدے .... ہر جا آہو چشم میدید عاشقانہ چشمی می خرامید۔ بے تاب ملاقات خوباں۔ بخواب از خیالات محبوباں ....

یہی جوانِ رعنا کا قصۂ میر و ایک دن سیر باغ کو جاتا ہے اور وہاں سے واپسی میں مہ پارہ پر عاشق ہوتا ہے :-

"از بوئے گلہا بد دماغ گشت و چوں خاطر افسردہ او وا نشد راہ خانہ سر کردہ۔ در رفتن

راہ دیوانگی بیشتر کرد ۔ ناگاہ برسر کوچہ از مہ پارہ دوچار شد کہ از غرفہ نظارہ عاشق روشنی میکرد "
نگاہش ہوشی داروئے بود کہ بیخودگی داشید یا ناوک جگردوزے بود کہ بخاک غلطانید ۔ "
غرض اس کے بعد اسی طرح عاشق کی پریشانی پھر مہ پارہ کا وہاں سے ہٹایا جانا
عاشق کا ساتھ ہونا ۔ پھر دریا پر پہونچکر دایہ کی مکاری ۔ عاشق کا ڈوبنا اس کے کچھ دن بعد
مہ پارہ کو لیکر دایہ کا ملنا وغیرہ بیان کرتے ہوئے یہ واقعہ لکھتے ہیں کہ جب مہ پارہ اور
دایہ کشتی پر چلی آرہی تھیں تو محبوبہ نے پوچھا کہ عاشق یہاں کس جگہ ڈوبا تھا ۔ دایہ نے مقام بتایا
اب مہ پارہ کے لئے لکھتے ہیں ۔
" این بیتاب عشق کجا ! کجا ! کردہ از محافہ در آب انداخت و بیک چشم زدن کار
خود ساخت ۔ امواج زنجیرہائے رنگین او شدہ بہ تہ کشیدہ بردند رفت ۔ دورکنار عاشق
مردہ کام جان خوابید ۔
اسکے بعد اختتام پر لکھتے ہیں ۔
میر اگرچہ نوشتن حالات عشق ہوس است ۔ ہمیں قدر بس است بیا دیگر
ہوس کن و خامہ را بگذار و بس کن عشق شعبدہ باز لیست معروف و مشہور تفرقانش بر
السنہ مذکور چوں شعبدہ سر میکند از آب آتش برمیکند ؎

عشق از محیط شعبدہ چوں سر بر آورد
از پردۂ محیط سمندر بر آورد

تذکرہ نکات الشعراء میر صاحب کا لکھا ہوا یہ ایک اُردو شعراء کا تذکرہ ہے
جو حال ہی میں طبع ہوا ہے اسکا سنہ تصنیف ۱۱۶۵ھ ہے
مرحوم پروفیسر آزاد نے اپنی مشہور عالم کتاب آب حیات میں اس تذکرے
کے متعلق عجیب و غریب باتیں بیان کی ہیں ۔ موصوف لکھتے ہیں کہ اس تذکرہ میں میر صاحب
نے ہزار اُردو شاعروں کا ذکر کرنے کا وعدہ کیا ہے ۔ حالانکہ ایسا قطعاً نہیں ہے اس میں

صرف شعرا شاعروں کا ذکر ہے۔

پروفیسر آزاد نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ میر صاحب نے نہایت درشت لہجہ میں ہر شاعر کی خبر لی ہے چنانچہ ولی کے لئے لکھا ہے کہ "او از شیطان مشہور تر بود" لیکن دراصل یہ بالکل غلط ہے۔ میر صاحب نے ہر شاعر کا ذکر اسی احترام سے کیا ہے جیسا کہ ایک تذکرہ نویس کو کرنا چاہیئے۔ صرف بمقتضائے انصاف وہ جن شعرا کو نہیں جانتے انکے متعلق اپنی ذاتی لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔

خان آرزو کی طرف سے میر صاحب صاف تھے لیکن انکی انصاف پسندی دیکھئے کہ خان آرزو کے تمام علمی احسانات کا نہایت فخر کے ساتھ اعتراف کرتے ہوئے اپنے مخصوص بلیغ اور معنی خیز انداز سے انکا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ "چراغ دودمان صفائے گفتگو کہ چراغش روشن باد۔"

رسوا کے لئے (جو بہت رسوا رہا کرتا تھا) فرماتے ہیں۔

"آخر در ہماں عریانی جامہ گزاشت"

ٹیک چند بہار مولف بہار عجم کے لئے لکھتے ہیں:-

"از لفظ لفظش ہزار ہزار رنگ معنی گل میکند"

شاہ مبارک (یک چشم) کے لئے کہتے ہیں:-

"از چشم پوشی روزگار یک چشمش از کار رفتہ بود"

ذکر میر

یہ میر صاحب کی خود نوشت سوانحعمری ہے جسمیں انھوں نے اپنے مختلف واقعات زندگی اور چند دیگر اہم تاریخی واقعات نہایت فصاحت اور بلاغت کے ساتھ بزبان فارسی ارقام فرمائے ہیں۔ یہ کتاب بھی حال ہی میں شائع کر دی گئی ہے۔ اسکے چند اقتباسات ذیل میں پیشکش ہیں۔

اپنے تحصیل علم کے متعلق لکھتے ہیں:-

"روزے در سر بازار چند کتابیے در دست نشستہ بودم۔ جوانے میر جعفر نام از آنجا راہ گذشت نظرش بر من افتاد۔ تشریف نہاد بعد از ساعتے گفت اے عزیز دریافتم شود کہ

ذوق خواندن داری من ہم کشتۂ کتابم۔ اماں مخاطبے لمی یابم۔ اگر شوق کامل داشتہ باشی چندے می رسیدہ باشم۔ گفتم دستے ندارم کہ خدمت از من بیاید۔ اگر لالہ ایں رنج برخود گوارہ کنی عین بندہ نوازی است۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از آں روز اکثر ملاقات آں سیرت و آدم صورت اتفاق می افتاد و بلطف بے نہایتم زماں نداد یعنی دماغ خود می سوخت و مرا چیزے می آموخت۔ تا مقدور من نیز بالش نرم زیر سر او گذاشتیم یعنی صرف او بود آنچہ میسّری داشتم۔ ناگاہ خطے از وطن او کہ از عظیم آباد بود رسیدہ۔ و آں مرد رخت خودکام و ناکام بآں صوب کشیدہ۔"

اپنی عربی تعلیم کے لیے لکھتے ہیں :۔

"بندہ ترک ملاقات عزیزاں گرفتہ بخواندن مطوّل مشغول شدم"

خاتمہ کتاب پر عالم کے پر عبرت سانحات بیان فرماتے ہیں :۔

"جہاں عجب حادثہ گاہ است۔ چہ مکانہا خراب گشتند۔ و چہ جواناں از ہم گذشتند۔ چہ باغہا ویراں شدند۔ چہ گلہا افسردند۔ چہ جواناں مردند۔ چہ مجلسہا برشکستند۔ چہ قافلہا رخت بستند۔ چہ عزیزاں رخت کشیدند۔ چہ مرداں بجاں رسیدند۔ ایں چشم عبرت بیں چہا دید و ایں گوش حق شنو چہا شنید ؎

ہر کاسۂ سر ز افسرے میگوید | ہر کہنہ خرابہ ز درے میگوید
دنیاست فسانہ پارۂ ما گفتیم | واں پارہ کہ ماند دگرے میگوید

اپنی پیری کی حالت :۔

دریں مدت کم ایں قطرۂ خوں کہ دلش نامند۔ انواع ستم کشیدہ و ہمہ خوں گردید مزاج ناساز داشتم، ملاقات ہمہ کس گذاشتم، اکنوں کہ پیری رسید، یعنی عمر عزیز بشصت سالگی کشید، اکثر اوقات بیماری باشم، چندے درد چشم کشیدم، ضعف بصر بچشم خود دیدم، عینک خواستم، دوست ایم سودم، نظر بریں شعر ترک نظر بازی نمودم ؎

دیدہ چوں محتاج عینک گشت فکر خویش کن
بر نفس دارند روز واپسیں آئینہ را

از وجع اسنان خود چہ گویم، حیران بودم کہ چارہ تا کجا جویم۔ آخر دل بر کندم و یک راہ از بیخ بر کندم ؎

روزی خود را بر بیخ از درد دنداں میخورم
ناں بجوں تر میشود تا پارہ ناں میخورم

غرضکہ از ضعف قویٰ و بید ماغی، و ناتوانی و دل شکستگی و آزردہ خاطری معلوم میشود کہ دیر نخواہم ماند، زمانہ ہم قابل ماندن نماندہ است دامن باید افشاند۔ اگر خاتمہ بخیر شود آرزو ہست ورنہ اختیار در دست اوست۔"

میر صاحب کی نثر کے یہ نمونے صاف بتا رہے ہیں کہ وہ ایک بلند پایہ[؟] نثر نگار تھے۔ ہر ہر جملہ انکی علمیت پر تیز روشنی ڈال رہا ہے۔ کاش وہ لوگ جنکو میر صاحب کی علمیت کا اعتقاد نہیں آنکھیں کھول کر ان عبارات کو پڑھیں۔

فارسی نظم علاوہ اُردو کلیات کے میر صاحب کا ایک فارسی[1] دیوان بھی ہے جسکے متعلق مصحفی کہتے ہیں:-

"دعوائے شعر فارسی نداشت لیکن فارسیش ہم کم از ریختہ نیست میگفت کہ سالے ریختہ موقوف کردہ بودم درآں حال دو ہزار شعر گفتہ تدوین کردم۔"

مصحفی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کی تمام فارسی شاعری صرف انکی ایک سال کی محنت ہے۔ گو یہ دیوان میری نظر سے کبھی نہیں گذرا لیکن ایڈیٹر صاحب نکات نے میر صاحب کے فارسی کلام کی جو تفصیل دی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنکے فارسی اشعار کی تعداد دو ہزار سے بہت زیادہ متجاوز ہو گئی ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ دو ہزار شعر

---

[1] یہ دیوان چونکہ طبع نہیں ہوا ہے لہذا میری نظر سے کبھی نہیں گذرا۔ اسکے متعلق معلومات کا ماخذ مختلف مضامین ہیں

تو انھوں نے (بقول مصحفی) ایک سال میں لکھے اس کے علاوہ وہ کبھی کبھی اور بھی فارسی میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں اور دو ہزار سے جتنے زیادہ شعر ہیں وہ سب بعد کی تصلیف ہیں۔

میر صاحب کا یہ فارسی دیوان ابھی تک طبع نہیں ہوا ہے۔ جتنے کہ انکا فارسی کلام کسی تذکرہ میں بھی نہیں ملتا۔ مرحوم حضرت عزیز لکھنوی فرماتے ہیں :۔

"اتفاقاً مجھے ایک نسخہ انکے (یعنی میر صاحب کے) فارسی دیوان کا ملا جو بصورت بیاض خط شفیعہ میں لکھا ہوا تھا۔ خط نہایت پاکیزہ اور مصنف کے عہد کا لکھا ہوا تھا۔ کیونکہ جا بجا میر صاحب کے نام کے ساتھ سلمہٗ اللہ تعالےٰ لکھا ہوا تھا۔ یقیناً یہ وہی دیوان ہے جسکا ذکر مصحفی نے اپنے تذکرے میں کیا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک مقدمہ لکھکر اسے چھپوا دیتا مگر میرے محترم دوست مولوی سبحان اللہ صاحب رئیس اعظم گورکھپور نے اسکو پسند کیا اور اب وہ انکے کتب خانہ عامرہ میں ہے مولانا کچھ مجھ سے زیادہ کتاب کے جوہر شناس اور قدردان ہیں۔ اس لئے مجھے چنداں تاسف نہیں۔"

مرحوم ایڈیٹر صاحب نیرنگ نے کلام میر کی جو فہرست درج کی ہے اسے پیش کرتے ہوئے میر صاحب کے مختلف اصناف کے فارسی کلام پر کچھ روشنی ڈالتا ہوں۔

غزلیات — میر صاحب کی تفصیل غزلیات فارسی حسب ذیل ہے :۔

ردیف الف = ۳۷ غزلیں اور چھ متفرق اشعار
ردیف با = تین غزلیں اور ایک شعر
ردیف تا = ۵۳ غزلیں اور ۵۵ متفرق شعر
" ثا = صرف ایک غزل
" جیم = ایک غزل
" حا = ایک غزل
" دال = ۷۷ غزلیں اور ۱۱ متفرق شعر

ردیف با = ۹ غزلیں اور ۱۰ متفرق شعر
" ذا = ۶ غزلیں دو شعر
" سین = ۳ " دو شعر
" شین = ۱۲ " سات شعر
" صاد = دو غزلیں ناتمام
" طا = دو شعر
" ظا = دو شعر
" عین = ایک غزل
" غین = ایک غزل
" قاف = دو غزلیں
" کاف = تین غزلیں اور دو شعر
" لام = سات غزلیں ایک مطلع
" میم = ۳۴ غزلیں ۲۵ شعر
" نون = ۲۲ غزلیں ۱۴ شعر
" واؤ = ۱۵ غزلیں
" ہا = ۱۲ غزلیں دس شعر
" یا = ۳۲ غزلیں ۲۲ شعر

اگر مصحفی کی تنقید "فارسیش ہم کم از ریختہ نیست" میں مبالغہ سمجھا جائے تو بھی میر حسن کی غزلوں کے لئے ہمیں کم از کم اتنا ضرور ماننا پڑیگا کہ وہ ایک خاص رنگ کی حامل ہیں۔ اور اپنی سادگی، تغزل اور اسلوب بیان کے اعتبار سے فارسی غزلوں میں بھی ایک ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ باوجود

ہندی ہونے کے فارسی پر میر صاحب کو اتنی قدرت حاصل تھی کہ اگر انکا کلام شعراء عجم میں ملا کر
رکھ دیا جائے تو شاید بہت مشکل سے تمیز کیا جا سکے۔ تحزّنیت اور نشتریت جو انکی شاعری کا جزو
تھے انکے فارسی کلام میں بھی جھلک رہے ہیں۔ ذیل میں کچھ اشعار پیش کئے ہیں جن سے میرے بیان کی تائید ہو سکتی ہے

شمع پر زینت اور آرائش کی تعبیر ہے در اصل معشوقوں کی قبروں پر زیب دیتا ہے عاشق
کی قبر کے لئے کچھ اور بھی سامان درکار ہے ؎

شمع بر تربت بہ گلعذاراں خوشنما است
برفشاں بر خاک من خاکستر پروانہ را — میر

آرزو کے متلاطم سمندر کو ساکن کرنے والی صرف موت ہے ؎

بمردن تسلی شدم ورنہ میر — نہایت بود آرزوئے مرا — میر

قتل ہونے کا ایک نیا انداز ؎

شدہ نعشم بلند و گشتہ شادیم — اندیدیم روئے قاتل را — میر

اپنی شاعری کی خصوصیت ؎

بجز انشائے حرف من اثر دارد — بہ بزم عیش تہ بہ کسے زبان مرا — میر

بلبل کے نالے میں تاثیر صرف اسوجہ سے ہے کہ وہ نالے کرنے میں میر صاحب کی شاگرد ہے ؎

شنود تو عندلیب جگر چاک میکند — آموختی ز میر مگر طرز نالہ را — میر

وہ غالب کی طرح اپنی فارسی کے لئے یہ نہیں کہتے ہیں کہ ؎

فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ — بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

لیکن میر صاحب بھی اتنا ضرور کہتے ہیں ؎

یا پیراں میروم رہ یافتہ یتیم عنایت کن
رہ آورد ست میر اشعار تو اہل صفاہاں را — میر

راہ محبت میں کھو جانے کا سبق ؎

بیالے میر در راہ محبت خویش را گم کن　　اگر خواہی کہ دریابی نشان بے نشاناں را　　میر

بہاری جی نے بھی اسی مضمون کو ایک دوسرے رُخ سے کہا ہے ؎

तंत्री नाद कबित्त रस सरस राग रति रंग ।
अनबूड़े बूड़े तरे जे बूड़े सब अंग ॥

ساز کی آواز، کیف شعری، محبت کے نغمے اور مستوں میں جو ڈوبا وہ تر گیا اور جو نہیں ڈوبا وہ ڈوب گیا

ایک بہترین خیال ؎

سخت دل ہر شب بدانانم نمی دانم چرا　　ہر سحر سر در گریبانم نمی دانم چرا　　میر

اسی غزل کا ایک اور شعر ؎

گریہ من گرچہ میدانم نہ دارد حاصلے　　باز صبح و شام گریانم نمیدانم چرا　　میر

موجودات کو نظر تعمق سے دیکھنے کا سبق ؎

نیستی سہل ز غیب ایں ہمہ مشہود آوردہ را　　رہ بسے طے شدہ باشد بوجود آمدہ را　　میر

گناہ ضمیر کی مخالفت کا نام ہے جب بات کیلئے واقعی ضمیر اجازت دے رہا ہے وہ گناہ ہرگز نہیں لہذا انحطاط یا

؎ بسکہ خوش دارد دل من مشرب رندانہ را　　بر سر بازار بر بسرعی کشم پیمانہ را　　میر

ایک مسلسل غزل ؎

اے ز انعام تو وا شد غنچۂ امکان ما　　آب در جو دارد از لطف تو باغ جان ما
با کرم گر کار افتد جرم ما ز اندیشت قدر　　یک پر کاہ است کوہ شاخ عصیان ما
دیدہ تر کے تسلی بخشش با شوق میشود　　منبع طوفاں شود یا رب سر مژگان ما
ایں نہ پنداری کہ مردن موجب آسودن است　　مرگ ہم یک منزل است از راہ بے پایان ما
میر اگر ایں است جوش گریہ در ہجران یار　　ابر خواہد برد آب از دیدۂ گریان ما　　میر

ایک غزل اور ؎

شب شیخ دید گردش چشم پیالہ را　　بر باد داد زاہدی دیرسالہ را

از ما حکایت غم دل میتواں شنید | ما خوب میکنیم بیان ایں مقالہ را
غافل ز دل مشو کہ غنیمت شمردہ اند | اہل نظر معاملہ ایں رسالہ را
میرؔ

رباعیات | میر حسنؔ کی رباعیاں چار مکمل ہیں اور چار کا صرف مطلع لکھکر چھوڑ دیا ہے۔ یہ رباعیاں بھی ہیں مثل ہیں دو ایک یار دوست کی یاد کا ایک یہ سحر انداز سے

وقت است کہ رو برگ یک بارہ کنیم | آں درد نہ داریم کہ ما چارہ کنیم
بیماری صعب عشق دارد دل ما | گر جامہ گذاریم کفن پارہ کنیم
میرؔ

عمر خیام کے لہجے میں دُنیا کی بے ثباتی کی تصویر سے

برخیز و رخ خود ز عمارت بر تاب | دُنیا ست سراب
ایں ہستی موہوم تو مانند حباب | نقشے ست بر آب
در فکر بناہائے غلط عمر عزیز | کردی ہمہ صرف
اکنوں کہ ازیں دشت گذر چوں سیلاب | اے خانہ خراب

مسدس | حضرت علیؓ کی مدح میں صرف ایک مسدس ہے جسکا صرف ایک بند ایک مضمون میں ملا ہے لیکن صحت میں اشکال ہونے کی وجہ سے میں اُسے نظر انداز کرتا ہوں۔

شہر آشوب | دلی سے متعلق صرف ایک شہر آشوب ہے جسکے پانچ شعر درج ذیل ہیں سے

اے صبا گر سوئے دلی بگذری | ہمچو صر صر آہ مگذ ز سرسری
بوسہ دہ بر ہر قدم از سوئے من | بود بر آں خاک عمرے روئے من
بر مقابر آیۂ رحمت بخواں | در مساجد خدمتے از من رساں
ہم بکن پیدا جبین تازہ را | سجدۂ بر ہر سر دروازہ

یہ بحث بھی ختم ہوئی!

بس اے سرمستان شراب میرؔ اب میخانہ کا دروازہ بند ہوتا ہے۔ یہ وہ شراب ہے کہ اگر تمام زندگی پی کر لنڈھا کرے گی تو بھی نہ ہمکو سیری ہو سکتی ہے نہ خم بادہ میں کمی آ سکتی ہے۔ چلو! ساقی کو دعا دیکر رخصت ہو۔

تمت

جولائی ۳۶ء

مطبوعہ و منشورہ

جنرل پبلشنگ اینڈ پرنٹنگ ہاؤس

سیتاپور